جلد (۳) عدد (۶)

ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ

۴۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

بیرون ہند کے لئے (سہ)

قیمت فی پرچہ (۸/)

خـــالی صفحـــه

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

دنیا کا نظام جن الٰہی قوانین پر قائم ہے ان میں سے ایک قانون یہ بھی ہے کہ اشیاء کو ان کے کمالات کی طرف ترقی دینے میں جس طرح مبدأ فیاض کی طرف سے علی قدر مراتب، جود و بخشش کا فیضان ہوتا ہے، اسی طرح خود اشیاء کو بھی کمال کے ہر نئے مرتبے میں اپنے پچھلے مرتبے کے لوازم اور مالوفات و مرغوبات کو قربان کرنا پڑتا ہے اور اس قربانی کے بغیر تحصیل کمالات کے سفر میں وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتیں۔ بخار کو پانی بننے کے لئے اپنی آزادی اور ہوائیت کو قربان کرنا پڑتا ہے، اور وہ تقییدات قبول کرنے ہوتے ہیں جو مائیت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پانی کو برف بننے کے لئے پھر اپنی رہی سہی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، اپنے بہت سے آبی خواص کی قربانی دینی ہوتی ہے تب جاکر اسے پتھر کی سی سختی اور شیشے کی سی صفائی اور چمک میسر ہوتی ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ بخار کے لئے حالت بخاریہ میں رہتے ہوئے اور ہوا کی سی آزادی و لطافت رکھتے ہوئے وہ کمالات بھی جمع ہوجائیں جو صورت مائیہ کے ساتھ مخصوص ہیں، اور وہ کمالات بھی جو برف کے لئے مقدر کئے گئے ہیں۔

یہ سنت اللہ ہے جس میں کوئی استثناء اور تغیر و تبدل نہیں، وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ تمام مخلوقات عالم پر یہی قانون جاری ہے، اور سب کی طرح انسان بھی اسی کے زیر اثر ہے۔ نطفہ اپنی صورت نطفیہ کو قربان کرکے صورت انسانیہ حاصل کرتا ہے، بچہ اپنے بچپن کو قربان کرکے جوانی حاصل کرتا ہے، اور جوان اپنی جوانی کھو کر بڑھاپے کی بزرگی حاصل کرتا ہے۔ پھر زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں ترقی کرنے اور اعلیٰ مراتب تک پہنچنے کے لئے انسان کو کچھ نہ کچھ قربانیاں نہ دینی پڑتی ہوں۔ بڑائی اور بزرگی کا دامن ہر میدان میں قربانی

اور ایثار کے ساتھ وابستہ ہے ایک بڑے فائدہ کے لئے بہت سے نقصانات برداشت کرنے پڑتے ہیں، ایک بڑی لذت کے لئے بہت سی تلخیاں گوارا کرنی ہوتی ہیں، ایک اعلیٰ مرتبے کے لئے بہت سے ان عزوں کو ہاتھ سے دینا پڑتا ہے جو ادنیٰ مراتب میں حاصل تھے۔ جس علامہ کی جلالت علمی پر آپ رشک کرتے ہیں اس سے پوچھئے کہ اس نے کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ اور کتنا خون جگر تحقیق و اکتشاف کی راہ میں کھپایا ہے؟ جس ملک التجار کی دولت کو دیکھ کر آپ کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اس سے پوچھئے کہ روپیہ کمانے کی جدوجہد میں کس طرح اس نے دن کے آرام اور رات کے چین کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے؟ جس مدبر سلطنت کے اقتدار اور شان و شوکت کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں، اس سے پوچھئے کہ اسے کتنی کشمکش، کتنی پریشانیوں، کتنی ٹھوکروں، اور کتنی روحانی و جسمانی اذیتوں کے بعد اس مقام تک پہنچنا نصیب ہوا ہے؟ غرض زندگی کا کوئی میدان لے لیجئے، ہر جگہ آپ یہی دیکھیں گے کہ کمال اور ترقی کا ہیولیٰ لذتوں کے خون سے تیار ہوتا ہے۔ اور کمال کے مراتب جتنے بلند ہوتے ہیں، ان کے لئے قربانیاں بھی اتنی ہی زیادہ درکار ہوتی ہیں۔

دنیوی کمالات سب کے سب جزئی کمالات ہیں اس لئے وہ قربانیاں بھی صرف جزئی چاہتے ہیں۔ دنیوی کمالات جتنے ہیں سب مادّی ہیں یا ان میں مادّے کی آمیزش ہے، اس لئے وہ قربانیاں بھی ایسی ہی چاہتے ہیں۔ جو مادّی قسم کی ہوں یا مادّے سے لگاؤ رکھتی ہوں دنیوی کمالات کا مقصود نفس یا تعلقات نفس کے لئے فوائد کا حصول ہوتا ہے، لہذا ان کے لئے صرف وہ چیزیں قربان کی جاتی ہیں جو نفس اور اس کے محبوبات و مطلوبات سے ماسویٰ ہیں۔ مگر کمال حقیقی کا معاملہ ان سب سے جداگانہ ہے۔ یہ کلی کمال ہے، قربانی بھی کلی چاہتا ہے۔ مادّے سے مجرد و منزّہ ہے، اس لئے جسم کی نہیں نفس و روح کی قربانی چاہتا ہے گو ظاہری شکل کے اعتبار سے اس کے لئے بھی بہت سی ایسی قربانیاں دینی پڑتی ہیں جو مادی قسم کی ہیں، یا مادّے سے لگاؤ رکھتی ہیں، لیکن دراصل وہ مادّے کی قربانیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ان محبتوں، اُن دلچسپیوں

ان لذتوں اور ان علائق کی قربانیاں ہیں جو انسانی روح اس دنیا کی مادی اشیاء کے ساتھ رکھتی ہے۔
اس کمال کا مقصود نفس یا متعلقات نفس نہیں، بلکہ حق ہے اس لئے وہ خود نفس کی قربانی چاہتا ہے اور بشرط ضرورت
نفس کے ساتھ ہر وہ شئے اس کے لئے قربان کرنی پڑتی ہے جو نفس کو مرغوب ہو۔

✓ یہی نکتہ ہے جسے قرآن مجید میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ:۔
لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ (۳: ۱۰)
یعنی تم نیکی کے مقام رفیع تک پہنچ نہیں سکتے جب تک کہ وہ چیزیں نہ خرچ کرو جنہیں تم عزیز و محبوب رکھتے ہو۔ یہ مِمَّا تُحِبُّونَ کا لفظ اتنی وسعت رکھتا ہے کہ جان، مال، اولاد، رشتہ دار، دوست وطن قوم، عزت، شہرت، ہر دلعزیزی، لذت و مسرت، عیش و آرام، عقائد و افکار، حریت خیال و آزادی عمل، غرض ہر محبوب شئے اس میں داخل ہے۔ اور ان سب چیزوں کو ماتحبون کے دائرے میں لیکر حکم لگایا گیا ہے کہ اگر تم "نیکی" کے اعلیٰ مراتب تک پہنچنا چاہتے ہو، تو تمہیں حق کی خاطر ان میں سے ہر چیز قربان کرنی پڑے گی۔ حق سب سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس سے محبت رکھو۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ جو چیز تمہارے دل میں اتنا گھر کرلے گی کہ اس کی محبت، حق کی محبت سے بڑھ جائے اور حق کے مقابلے میں تم اس کو عزیز رکھنے لگو، وہی بت ہے صنم ہے، بنائے شرک و کفر ہے نیکی کے مقام تک پہنچنے میں وہی سنگ راہ ہے۔ اس کمال کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلی ضرب اسی بت پر لگاؤ اور اسے پاش پاش کرکے حق کی محبت کو سب محبتوں پر غالب کردو۔

غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں اول سے لیکر آخر تک جو کچھ ہے قربانی ہی قربانی ہے
اسلام میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے انسان کو آزادی فکر و آزادی عمل کی قربانی دینی پڑتی ہے،

اسلام" لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اب آپ اس کے لئے آزاد نہیں ہیں کہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں اور جو راہ عمل پسند کریں اس پر چلنے لگیں۔ بلکہ آپ کا کام وہ اعتقاد رکھنا ہے۔ جو خدا اور رسول نے پیش کیا ہے، اور ان احکام و قوانین کے مطابق چلنا ہے جو خدا اور اس کے رسول نے مقرر کرتے ہیں

اِتَّبِعُوا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷:۱) جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری جانب اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اسے چھوڑ کر ان کی پیروی نہ کرو جن کو تم نے دوست بنالیا ہے۔

یہ "اسلام" یا "نیکی" کے راستے میں پہلا قدم ہے، اور اسی پر اتنی بڑی قربانی دینی پڑتی ہے کہ اچھے اچھے اسی مقام پر ڈگمگا جاتے ہیں یہاں زندگی کے ہر شعبے میں حلال اور حرام کے حدود ہیں، خبیث اور طیب کے امتیازات ہیں، فرائض و طاعات ہیں، حقوق و واجبات ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر کیا ہے۔ داعیات نفس قدم قدم پر انسان کو اثم و عدوان کی طرف کھینچتے ہیں، مگر اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ حدود اللہ پر نفس کی ساری خواہشوں کو بھینٹ چڑھاؤ، لذتوں کا خون کرو، فائدوں کو قربان کر دو یہ تقویٰ اور پاکیزگی کی راہ بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس پر ایک قدم بھی انسان اپنے جذبات و داعیات اپنے لطف اور اپنے فوائد کی قربانی دیے بغیر نہیں چل سکتا فضل و احسان کا مقام تو بہت بلند ہے۔ فرائض و واجبات کے ٹھیک ٹھیک بجا لانے حقوق کو پوری طرح ادا کرنے، اور گناہ کے راستوں سے بچ نکلنے ہی میں نفس پر کچھ کم جبر نہیں کرنا پڑتا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ تو صرف پہلا ہی قدم ہے، یہ پورا اسلام نہیں ہے، بلکہ اسے محض اسلام میں داخلہ کا امتحان سمجھیے۔ اسلام صرف یہی نہیں ہے کہ آپ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، بشرط استطاعت حج اور زکوٰۃ ادا کریں، معاصی سے مجتنب رہیں اور حقوق ادا کرتے رہیں بلکہ اسلام کی اصلی روح یہ ہے

کہ آپ حق کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز رکھیں اور جب موقع آئے تو کسی چیز کو بھی حق پر فدا کر دینے میں دریغ نہ کریں۔ اگر کوئی ایسا وقت آجائے کہ ایک طرف حق ہو اور اس کے ساتھ جان و مال کا زیاں ہو مصیبتیں اور تکلیفیں ہوں، رسوائیاں اور ٹھوکریں ہوں اور دوسری طرف باطل ہو، اور اس کے ساتھ عیش و آرام ہو، لطف و مسرت ہو، اور ہر طرح کے فائدے ہوں، تو مسلمان وہی ہے جو حق کے پہلو کو اختیار کرے، اور اس کی خاطر ان سب مصائب کو بخوشی برداشت کرے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔ (۲: ۱۹)	ہم ضرور تم کو کچھ خوف اور بھوک اور جان و مال اور ثمرات کے زیاں سے آزمائینگے اور (اے نبی) تو ان صبر کرنے والوں کو بشارت دیدے جن پر اگر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا ہی کے ہیں اور پھر اسی کی طرف پھرنا ہے۔

اگر کسی وقت خود اپنے باپ بھائی، اہل خاندان اور دوست حق کے دشمن ہو جائیں تو مسلمان وہی ہے جو حق کے لئے ان سب کو چھوڑ دے اور کسی سے تعلق نہ رکھے:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (۵۸: ۳)۔	تو کوئی قوم ایسی نہ پائیگا جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان بھی رکھتی ہو اور پھر اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت بھی رکھے، چاہے وہ دشمنان خدا اور رسول ان کے باپ یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہوں

اگر کسی وقت قوم اور وطن کی حق سے دشمنی ہو جائے تو مسلمان وہی ہے جو حق کی خاطر قوم سے قطع تعلق کرے اور وطن کو خیرباد کہدے، ورنہ اس کو منافق کہا جائیگا خواہ وہ کیسا ہی نمازی پرہیزگار ہو:

فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا فِي	تم ان کو ہرگز دوست نہ بنانا جب تک کہ وہ خدا کی راہ

سَبِيْلِ اللّٰهِ (۴: ۱۲) میں ہجرت نہ کریں۔

اگر کسی وقت دشمنانِ اسلام کے خلاف جنگ کی ضرورت پیش آجائے تو مسلمان وہی ہے جو ہتھیلی پر سر رکھ کر مرنے اور مارنے کے لئے نکل آئے، اور حق کی خاطر جان قربان کر دینے میں ذرا دریغ نہ کرے۔ جس نے اس موقع پر کوتاہی کی اس کا دعوئے اسلام جھوٹا ہے خواہ کتنا ہی بڑا عابد و زاہد کیوں نہ ہو۔

وَمَا اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا۔ (۳: ۱۷)

جس روز دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ ہوئی، اس دن تم پر جو مصیبت آئی وہ اللہ کے حکم سے تھی اور اس لئے تھی کہ مومنوں اور منافقوں کا فرق معلوم ہو جائے۔

غرض اسلام کچھ نہیں ہے، مگر حق پر فدا ہو جانے اور ہر عزیز سے عزیز شئے فدا کر دینے کا ایک عاشقانہ جذبہ۔ جس شخص میں یہ جذبہ موجود نہ ہو۔ جو شخص حق کے مقابلے میں جان یا مال، یا اولاد یا ملک و قوم، یا کسی اور دنیوی چیز کو عزیز رکھتا ہو، اس کا اسلام ادھ موا بلکہ بے جان ہے۔

قرآن مجید میں جس طرح سے اس سچی اسلامی روح کو پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور اسی غرض کے لئے پچھلی امتوں کے انبیاء اور صالحین کے فداکارانہ واقعات کو موثر پیرائے میں دہرایا گیا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو حق کی طرف بلاتے ہیں، سالہا سال بلکہ قرنہا قرن تک شدید مصائب برداشت کرتے ہیں اور جب وہ نہیں مانتی تو خدا سے عرض کرتے ہیں کہ خدایا ان کافروں میں سے ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑ۔ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔ (۷۱: ۲) ان کی آنکھوں کے سامنے بیٹا غرق ہوتا ہے، بیوی تباہ ہوتی ہے، مگر ایمان میں ذرا فرق نہیں آتا۔ حضرت لوط علیہ السلام اپنی بدکار قوم کو چھوڑ کر ہجرت اختیار کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی طرف بلایا جاتا ہے اور قید و ذلت کی دھمکی دیجاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مجھے گناہ کے مقابلہ میں قید زیادہ محبوب ہے۔ رَبِّ السِّجْنُ

اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ (۱۲: ۴) فرعون کے ساحر حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد بے تکلف اعلان کر دیتے ہیں کہ اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَهٰرُوْنَ (۲۶: ۳)۔ ہم پروردگار عالم پر ایمان لے آئے جو موسیٰ اور ہارون کا خدا ہے۔ فرعون ان کو سخت عذاب دیکر ہلاک کر دینے کی دھمکی دیتا ہے تو وہ صاف کہدیتے ہیں کہ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ هٰذِهِ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۲۰: ۳)۔ تجھے جو کچھ کرنا ہے کرگذر۔ تیرا حکم تو بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے۔ اصحاب کہف اپنی قوم کے مذہب سے علانیہ تبری کرتے ہیں کہ ہم خداوند ارض و سما کو چھوڑ کر کسی کی عبادت نہ کریں گے، رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلٰهًا (۱۸: ۲) اور جب قوم کے راستے سے ان کا راستہ الگ ہو جاتا ہے تو گھر بار عزیز اقارب سب کو چھوڑ کر ایک غار میں جا بیٹھتے ہیں۔

ان سب سے بڑھ کر حضرت ابراہیم کی خدا کاریاں تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ فرمایا ہے۔ انہوں نے حق کی خاطر وہ سب کچھ قربان کیا جو دنیا میں ایک انسان کو عزیز ہو سکتا ہے۔ باپ دادا کے مذہب کو چھوڑا اور صاف اعلان کیا کہ تمہارے معبودوں سے مجھے کچھ سروکار نہیں۔ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ (۴۳: ۳) قوم اور سلطنت اور خود اپنے باپ سے دشمنی مول لی۔ ان کے بتوں کو توڑا قوم نے ان کو آگ کا عذاب دینا چاہا تو انہوں نے آگ کے گڑھے میں گرنا قبول کیا مگر حق کو چھوڑنا گوارا نہ کیا، پھر اپنے باپ، اپنے خاندان اور اپنی قوم سب کو چھوڑ کر وطن سے تن بتقدیر نکل کھڑے ہوئے اور سب سے کہدیا کہ ہمارا اب تم سے کچھ تعلق نہیں، ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے دشمنی ہو گئی تا وقتیکہ تم خدائے واحد پر ایمان نہ لاؤ۔ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ (۶۰: ۱) یہ سب محبتیں قربان کر دینے کے بعد ایک محبت باقی رہ گئی تھی جو حق کی محبت کے پہلو بہ پہلو دل میں جاگزیں تھی۔ حکم ہوا کہ اس بت کو بھی توڑ دو۔ خواب میں

دکھایا گیا کہ اپنے ہاتھوں اپنے عزیز بیٹے کو جو بڑھاپے کی لکڑی تھا ذبح کر رہے ہیں۔ حضرت حق آزمانا چاہتے تھے کہ یہ دوستی کا مدعی اولاد کی محبت کو بھی ہماری محبت پر قربان کرتا ہے یا نہیں مگر وہ سچا مسلمان اس آزمائش میں بھی پورا اترا۔ اس کا دعوی عشق سچا تھا۔ جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیداری میں بھی کر دکھانے پر آمادہ ہو گیا۔ اس طرح جب حق کی محبت پر ساری محبتیں قربان ہو گئیں، تب بارگاہ خداوندی سے اپنے اس بندے کو ایمان کی سند دی گئی۔ اِنَّہٗ مِنْ عِبَادِ نَا الْمُؤْمِنِیْنَ (۳۷: ۳) اور اسے نوع بشری کا امام بنایا گیا۔ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲: ۱۵) اور تمام عالم کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ تمہارے لئے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگی ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔
قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرَاھِیْمَ وَ الَّذِیْنَ مَعَہٗ (۶۰: ۱)

عیدالاضحی کا تہوار اسی روح کو سال بسال تازہ کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ قربانی کی ظاہری شکل، جانور پر چھری چلانا، اس کا خون بہانا فی نفسہٖ مقصود نہیں ہے، بلکہ ان ظاہری اعمال سے دراصل اس سب سے بڑی قربانی کی یاد تازہ کرنا مقصود ہے جو حضرت ابراہیم نے محبوب حقیقی کے لئے دی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ فعل عبث ہے، ایک جانور کو ذبح کر دینے سے کیا فائدہ؟ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ مہذب قومیں جو بڑے بڑے آدمیوں کے مجسمے نصب کرتی ہیں۔ اور ان کی برسیاں مناتی ہیں۔ ان سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ یہی نا کہ ان ظاہری علامتوں سے ان کے کارناموں کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کی تقلید کا جذبہ دلوں میں زندہ ہوتا ہے۔ بس یہی فائدہ اس قربانی کا بھی ہے۔ خدا کو جانور کا گوشت پوست اور اس کا خون نہیں پہنچتا، بلکہ وہ ایثار و فدویت کی روح اس کو عزیز ہے جو اس کے پاک بندے ابراہیم کے رگ و پے میں ساری تھی، اور وہ چاہتا ہے کہ ہر مسلمان میں یہی روح پیدا ہو، ہر مسلمان اسی طرح اپنی تمام محبتوں کو حق کی محبت پر قربان کرنے کے لئے آمادہ رہے۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (۲۲: ۵) اللہ کو ان کے گوشت اور ان کے خون نہیں پہنچتے بلکہ اسے تمہارا تقویٰ پہونچتا ہے۔

پچھلے زلزلہ میں صوبہ بہار کی مسجدیں جس کثرت سے منہدم ہوی ہیں۔اس کا حال آپ کو معلوم ہوچکا ہے۔زلزلے سے تباہ ہونے والوں کی امداد ہندوستان اور بیرون ہند سے بلا امتیاز مذہب وملت ہورہی ہے، اور اس معاملہ میں یہی بہتر ہے کہ سب قومیں مشترک طور پر اس مشترک مصیبت کے دفع کرنے میں حصہ لیں لیکن مساجد اللہ کی تعمیر اور مرمت کا معاملہ اس سے جداگانہ ہے۔یہ کام صرف مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے کہ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (۹: ۳)۔ مسلمانوں کے لئے یہ بڑے شرم کی بات ہوگی اگر انھیں اپنی مسجدوں کی اصلاح حال کے لئے بھی غیرمسلموں کی طرف استعانت کا ہاتھ بڑھانا پڑا پس جو مسلمان کسی کار خیر میں اپنا روپیہ صرف کرنا چاہتے ہوں، وہ اس کام کو ایک بہترین کام سمجھیں، اور دل کھول کر اس کے لئے روپیہ بھیجیں۔

تعمیر مساجد کے کام کو صوبہ بہار کی ایک ایسی جماعت نے اپنے ذمہ لیا ہے جس سے زیادہ قابل اعتماد جماعت اس صوبہ میں کوئی اور نہیں ہوسکتی۔اس میں صوبہ کی امارت شرعیہ اہل حدیث کانفرنس، مومن کانفرنس، مسلم چیمبر آف کامرس (مسلم ایوان تجارت) اور دوسری معتبر جماعتیں شریک ہیں، اور سر سلطان احمد، مولانا سید شاہ سلیمان صاحب، اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب جیسے لوگوں کی شرکت اس امر کے لئے کافی ضمانت ہے کہ روپیہ اپنے صحیح مصرف میں صرف ہوگا۔

گذشتہ چند سال سے مولانا لقاء اللہ عثمانی صاحب حیدرآباد میں ایک مفید دینی خدمت

انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے قدیم اسلامی طرز پر مختلف محلوں کی مسجدوں میں مکتب قائم کئے ہیں۔
جن میں رات کے وقت لوگوں کو قرآن مجید، مسائل دینیہ اور عام نوشت وخواند کی تعلیم دیجاتی
ہے۔ تعلیم کے لئے رات کا وقت خاص کر اس لئے رکھا گیا ہے کہ جو لوگ دن کو اپنے کاروبار میں
مشغول رہنے کی وجہ سے علم حاصل نہیں کر سکتے یا جو بچے دوسرے مدارس میں پڑھتے ہیں اور وہاں ان کی
دینی تعلیم ناقص رہ جاتی ہے۔ وہ ان مدارس شبیہ سے فائدہ اٹھائیں۔ ہم نے خود ان مدرسوں کو
کئی مرتبہ دیکھا ہے۔ اور اس منظر سے دل کو بڑی مسرت ہوئی ہے کہ صرف چھوٹی عمر کے بچے ہی
نہیں، بلکہ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھے بھی اپنے کاروبار سے فارغ ہو کر یہاں آتے
ہیں اور کلام اللہ کا درس لیتے ہیں۔ ان مدارس کا خرچ بہت کم ہے۔ مشکل سے ایک مدرسہ پر دس پندرہ
روپے ماہوار خرچ ہوتے ہوں گے۔ مگر ان سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ اس خرچ سے بدرجہا زیادہ
ہے۔ مولانا اس تحریک کو نہ صرف حیدرآباد بلکہ اضلاع میں بھی پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔
ضرورت ہے کہ مسلمان اس کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں اور اپنے اپنے محلوں یا بستیوں کی مسجدوں
میں مقامی چندے سے اس قسم کے مدرسے قائم کر کے ان کو مرکزی نظام کے ساتھ وابستہ کریں۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی

ایمان

۲- ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ کا مقصد فرشتوں پر ایمان دراصل ایمان باللہ کا تمہ اور اس کا ضمیمہ لازمہ ہے۔ اس کا مقصد محض یہی نہیں ہے کہ ملائکہ کے وجود کا اثبات و اقرار کیا جائے، بلکہ مقصد اصلی یہ ہے کہ نظام وجود میں ان کی صحیح حیثیت کو سمجھ لیا جائے، تاکہ ایمان باللہ خالص توحید پر قائم ہو، اور شرک و عبادت ماسوی اللہ کے تمام شائبوں سے پاک ہو جائے۔

جیساکہ پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے۔ ملائکہ کا ایک اجمالی تصور تمام ملل و نحل میں کسی نہ کسی طور پر موجود رہا ہے۔ اور اسی تصور پر مختلف مذاہب نے مختلف اعتقادات کی عمارتیں قائم کرلی ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ نوامیس فطرت اور قدرت کی وہ طاقتیں ہیں جو نظام کائنات کے مختلف شعبوں کو چلا رہی ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ دیوتا ہیں۔ جن میں سے ہر ایک کارگاہ عالم کے ایک ایک محکمہ کا صدر ہے، مثلاً کوئی ہوا کا مالک، کوئی بارش کا، کوئی روشنی کا اور کوئی حرارت یا آگ کا۔ کسی کے اعتقاد میں وہ خدا کے نائب اور مددگار ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ارباب الانواع ہیں۔ کسی کے خیال میں وہ عقول ہیں۔ کسی کی رائے میں وہ خدا کے تصورات ہیں، اور کوئی ان کو خدا کی اولاد سمجھتا ہے۔

پھر کسی نے ان کا مادی جسمانی وجود مانا ہے، کسی نے انھیں مجردات و مفارقات میں سے شمار کیا ہے، کسی نے ان کو سیارات و نیرات کے ساتھ متحد الوجود کردیا ہے۔ اور کسی نے ان کے متعلق دوسرے

عجیب و غریب تصورات قائم کئے ہیں۔ فی الجملہ ارباب مذاہب میں فرشتوں کے متعلق یہ اعتقاد عام رہا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طور پر خدا کی خدائی میں شریک ہیں، اور اس لئے ان کے ہیکل یا بت بنا کر، یا ان کی تصویریں نقش کر کے ان کی عبادت کی گئی ہے، ان سے دعائیں مانگی گئی ہیں، ان کو حاجت روا، فریاد رس اور شفیع قرار دیا گیا ہے، اور اسی کی بدولت دنیا میں شرک کا ہنگامہ گرم رہا ہے

نظام وجود میں فرشتوں کی حیثیت قرآن نے اگر ایک طرف خدا کے وجود، صفات، اور افعال میں خالص اور کامل توحید قائم کی اور دوسری طرف ملائکہ کا ایک صحیح تصور پیش کیا تاکہ وہ دروازہ ہی بند ہو جائے جس سے شرک داخل ہوتا ہے۔ اس نے فرشتوں کی حقیقت سے کوئی بحث نہ کی کہ یہ بحث دور از کار ہے، اپنے اندر کوئی جوہریت نہیں رکھتی، انسان کے لئے نہ اس میں کوئی فائدہ ہے، اور نہ اس کو انسان سمجھ سکتا ہے، اصل مسئلہ جو تصفیہ طلب تھا وہ صرف یہ تھا کہ نظام وجود میں فرشتوں کی حیثیت کیا ہے، اور اس کو قرآن مجید نے خوب واضح کر دیا۔ اس نے بتایا کہ فرشتے خدا کی اولاد نہیں، نہ اس کے شریک کار ہیں، بلکہ محض اس کے بندے اور غلام ہیں۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحَانَهٗ بَلْ
عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ، لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ
وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ، يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا
لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ
(۲۱ : ۲)

کافروں نے کہا کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ پاک ہے خدا وہ (فرشتے) تو اس کے معزز بندے ہیں اس کے آگے بڑھ کر بات تک نہیں کر سکتے، اور بس وہی کرتے ہیں جس کا وہ حکم دیتا ہے۔ جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے سب کو خدا جانتا ہے، وہ کسی کی سفارش نہیں کر سکتے سوائے اس کے جسے خدا پسند فرماتا ہو، اور وہ جلال خداوندی سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ان کی حیثیت مدبرات امر کی ہے (۷۹ : ۱) یعنی وہ صرف ان امور کی تدبیر کرتے ہیں جو اللہ نے

ان کے سپرد کر دیے ہیں۔ خدائی میں شریک ہونا تو درکنار ان میں اتنی مجال بھی نہیں کہ اس کے حکم سے ایک سرمو تجاوز کر سکیں ان کا کام تو محض اطاعت اور عبادت ہے ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اپنے وظیفہ سے غافل نہیں ہوتے اور ہر دم اپنے رب کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں۔

يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ۔ (۱۳:۲)۔

بجلی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کرتی ہے اور فرشتے خوف کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے ہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۱۶:۶)

اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں چلتے پھرتے ہیں اور ملائکہ وہ سرتابی نہیں کرتے، اپنے رب سے جو اُن سے بالاتر ہے ڈرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا حکم دیا جاتا ہے

وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ (۲۱:۲)

اسی کے مملوک ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور جو اس کے پاس (مقرب) ہیں۔ وہ اس کی بندگی سے سرتابی نہیں کرتے، تھکتے نہیں شب روز اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (۶۶:۱)

وہ کبھی اس حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتے جو خدا نے ان کو دیا ہے، اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے

اس تصور نے شرک کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رکھی۔ کیونکہ جن پر خدائی کا گمان کیا جا سکتا تھا وہ سب ہماری طرح عاجز و درماندہ بندے ثابت ہو گئے۔ اس کے بعد ہماری عبادتوں، ہماری نیازمندیوں، ہماری استعانتوں، اور ہمارے اعتماد و توکل کا مرجع بجز خدا کی ذات کے اور کون ہو سکتا ہے

انسان اور فرشتوں کی اضافی حیثیت

پھر یہی نہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر قرآن مجید نے

انسان اور ملائکہ کی اضافی حیثیت بھی بتادی ہے تاکہ انسان ان کے مقابلہ میں اپنے مرتبے کو اچھی طرح سمجھ لے۔ کلام الٰہی میں جہاں تخلیق آدم کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خلافت سے سرفراز فرمایا تو ملائکہ کو ان کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا اور بجز ابلیس کے اور سب نے ان کو سجدہ کیا (بقرہ ۴۔ اعراف ۲، بنی اسرائیل ۷، کہف ۷، طٰہٰ ۷، صٓ ۵) ملائکہ نے اپنی تسبیح و تقدیس کی بنا پر آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں اپنی فضیلت کا دعویٰ کیا تو حق تعالیٰ نے ان کے اس دعویٰ کو رد فرما دیا اور امتحان سے کر ثابت کر دیا کہ ہم نے آدم کو تم سے زیادہ علم بخشا ہے۔ ابلیس نے اپنے مادۂ تخلیق کو بنائے فضیلت قرار دیکر آدم کی بزرگی تسلیم کرنے اور ان کے آگے سربسجود ہونے سے انکار کیا تو اسے ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ یہ چیز ایک طرف انسان میں عزت نفس کا احساس پیدا کرتی ہے، اور دوسری طرف اس کے تمام جذبات عبودیت کو خدا پرستی کے مرکز پر سمیٹ لاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام وجود میں کوئی شئے بجز حق تعالیٰ کے انسان سے افضل نہیں ہے۔ ملائکہ اگرچہ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ہیں اور تمام دوسری اشیاء پر فضیلت رکھتے ہیں مگر انسان کے آگے وہ بھی سربسجود ہو چکے ہیں۔ پھر انسان کا مسجود، اس کا معبود، اس کا مستعان و مجیب الدعوات، حضرت حق کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟۔

اس طرح ایمان بالملائکہ کے صحیح علم و معرفت پر قائم ہو جانے سے ایمان باللہ بالکل خالص اور منزہ ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایمان بالرسل

حقیقت رسالت | توحید کے بعد اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ "رسالت" ہے جس طرح اعتقاد کی جہت میں توحید اصل دین ہے۔ اسی طرح اتباع کی جہت میں رسالت اصل دین ہے۔ رسالت کے لغوی معنی

پیغامبری کے ہیں۔ جو شخص کسی کا پیغام کسی دوسرے شخص کے پاس لیجائے وہ "رسول" ہے مگر اسلام کی اصطلاح میں رسول اس کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائے، اور خدا کے حکم سے راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے اسی لئے قرآن میں رسول کے لئے "ہادی" کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے، یعنی وہ جو سیدھا راستہ دکھائے۔

خدا نے ایک رہبر تو ہر انسان کے اپنے نفس میں مقرر کر رکھا ہے جو الہام آلہی کی بنا پر اچھے اور برے خیالات، غلط اور صحیح اعمال کے درمیان تمیز کر کے انسان کو فکر و عمل کا سیدھا راستہ دکھاتا ہے جیسا کہ فرمایا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (۹۱) لیکن چونکہ اس رہنما کی ہدایت واضح نہیں ہے اور اس کے ساتھ بہت سی ذہنی اور خارجی قوتیں ایسی بھی لگی ہوئی ہیں جو انسان کو برے اعمال کی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور ان وجوہ سے تنہا اس جبلی رہنما کی ہدایت بے شمار ٹیڑھے راستوں میں سے حق کی سیدھی راہ نکال لینے اور اس پر بے خطر چلنے میں انسان کے لئے کافی نہیں ہو سکتی اس لئے اللہ تعالیٰ نے خارج سے اس کی پورا کیا اور انسان کی طرف اپنے پیغامبر بھیجے تاکہ وہ علم و معرفت کی روشنی سے اس باطنی رہنما کی امداد کریں، اور اس مبہم فطری الہام کو آیات بینات کے ذریعہ سے واضح کر دیں جس کی روشنی جہالتوں اور گمراہ کن قوتوں کے ہجوم میں مدہم پڑ جاتی ہے۔

یہی منصب رسالت کی اصل ہے جو لوگ اس منصب پر سرفراز کئے گئے ہیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیر معمولی علم اور نور بصیرت عطا کیا گیا ہے جس سے وہ ظن و تخمین کی بنا پر نہیں بلکہ علم الیقین کی بنا پر ان امور کی حقیقت جان گئے ہیں جن میں عامۃ الناس اختلاف کرتے ہیں اور اس نور بصیرت سے انہوں نے ٹیڑھے راستوں میں سے حق کا سیدھا اور صاف راستہ دیکھ لیا ہے۔

رسول اور عام رہنماؤں کا فرق | خارجی رہنما کی ضرورت ہر زمانہ میں انسان نے تسلیم کی ہے

کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ انسان کے لئے محض اس کے اپنے باطنی رہنما کی ہدایت کافی ہے۔ آباد اجداد خاندان، قبیلہ یا قوم کے بزرگ، اساتذہ، اہل علم، مذہبی پیشوا، سیاسی لیڈر، اجتماعی مصلحین اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کو جن کی دانشمندی پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا ہمیشہ رہنمائی کا منصب دیا گیا ہے اور ان کی تقلید کی گئی ہے لیکن جو چیز ایک رسول کو ان دوسری قسم کے رہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے وہ علم ہے۔ دوسرے رہنماؤں کے پاس علم نہیں ہے وہ محض ظن و تخمین کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں اور اس رائے میں ہوائے نفس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں، اس لئے جو عقائد و قوانین وہ وضع کرتے ہیں، ان کے اندر حق اور باطل دونوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ پورا پورا حق ان کے قائم کئے ہوئے طریقوں میں نہیں ہوتا۔ اسی حقیقت پر قرآن مجید بار بار تنبہ کرتا ہے کہ:۔

إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ (۵۳: ۱)

وہ جس چیز کی پیروی کرتے ہیں وہ بجز گمان اور خواہشات نفس کے اور کچھ نہیں ہے۔

وَمَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۵۳: ۲)

اُن کے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں اور گمان کا حال یہ ہے کہ وہ حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُم بِغَيْرِ عِلْمٍ (۳۰: ۴)

مگر ظالموں نے اپنے خواہشات نفس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ ثَانِيَ عِطْفِهِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (۲۲: ۱)

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو اللہ کے بارے میں بغیر کسی علم و ہدایت اور کتاب منیر کے جھگڑتا ہے اور تکبر کرتا ہے تاکہ اللہ کے راستہ سے بھٹکا دے

وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ

اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا۔ جس نے اللہ کی

هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸ : ۵) سے آئی ہوئی ہدایت کے بجائے اپنی خواہش کا اتباع کیا

بخلاف اس کے رسول کو اللہ کی طرف سے "علم" عطا کیا جاتا ہے ۔ اس کی رہنمائی گمان اور ہوائے نفس کی بنا پر نہیں ہوتی .... بلکہ وہ خدا کے بخشے ہوئے نور علم سے جس سیدھے رستے کو صاف اور واضح دیکھتا ہے اسی کی طرف ہدایت کرتا ہے ۔ چنانچہ قرآن میں جہاں کہیں انبیا علیہم السلام کو "رسالت" کے منصب پر سرفراز کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں یہی کہا جاتا ہے کہ ان کو "علم" بخشا گیا ۔ مثلاً حضرت ابراہیم سے نبوت کا اعلان اس طرح کرایا جاتا ہے :۔

يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۔ (۱۹ : ۳) اے پدر عزیز یقین جان کہ میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا ۔ لہذا تو میری پیروی کر میں تجھے سیدھے راستہ پر چلاؤنگا ۔

لوط علیہ السلام کو نبوت بخشنے کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے :۔

وَلُوطًا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (۲۱ : ۵) اور لوط کو ہم نے قوت فیصلہ اور علم بخشا ۔

حضرت موسیٰ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :۔

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَاسْتَوَىٰ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا (۲۸ : ۲) اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا اور پورا آدمی بن گیا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا ۔

داؤد و سلیمان علیہما السلام کے نبوت پر سرفراز ہونے کا ذکر بھی اسی طرح کیا جاتا ہے

وَكُلًّا آتَيْنَا حُكْمًا وَعِلْمًا (۲۱ : ۶) ان میں سے ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم عطا کیا ۔

نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا جاتا ہے ۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آیا ہے

جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔ (۲:۱۳)

ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ سے تم کو بچانے والا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

منصب رسالت، اور عام رہنماؤں کے مقابلہ میں رسول کے امتیازی مقام کی توضیح کے بعد اب ہمیں ان اصولی امور کی طرف توجہ کرنی چاہئے جو رسالت کے بارے میں قرآن مجید نے پیش کئے ہیں

ایمان باللہ اور ایمان بالرسل کا تعلق

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب رسول کے پاس علم کا ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کو حاصل نہیں ہے، اور خدا کی طرف سے اس کو بصیرت کا وہ نور عطا کیا گیا ہے جس سے عام انسان محروم ہیں، تو خدا کے بارے میں صرف وہی اعتقاد صحیح ہو سکتا ہے جو رسول نے پیش کیا ہے۔ اگر کوئی شخص خود اپنے غور و فکر یا دوسرے عقلا و حکماء کی تعلیمات پر کوئی اعتقاد قائم کرے تو نہ صرف خدا کے بارے میں اس کا عقیدہ درست نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ان دوسرے امور ماوراء طبیعت کے بارے میں بھی کوئی سچی واقفیت بہم نہیں پہونچا سکتا جو دین کے بنیادی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں اور عام انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔ پس جملہ ایمانیات اور معتقدات کی صحت کا کلی انحصار ایمان بالرسل پر ہے اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ہم اس واسطہ سے قطع تعلق کر کے علم صحیح سے دامن فکر کو وابستہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ ایمان بالرسل پر زور دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (۶۵:۲)

اور کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت حساب لیا اور انہیں بڑی بری سزا دی جس سے انہوں نے اپنے کئے کا مزا چکھ لیا اور آخر کار ان کا انجام نامرادی رہا۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۔ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۔ (۴: ۲۱)	جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں میں تفریق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض سے انکار کریں گے، اور چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کی کوئی راہ نکالیں وہ یقیناً کافر ہیں۔ اور کافروں کے لئے ہم نے ایک رسوا کن عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور ان میں سے کسی کے درمیان انہوں نے تفریق نہ کی ان کو عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے اجر عطا فرمائے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔
وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (۴: ۱۷)	اور جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسول سے جھگڑا کرے اور ایمان لانے والوں کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے اس کو ہم اسی راستے پر پھیر دیں گے جس پر وہ خود پھر گیا ہے اور آخر کار

اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ اور ایسی ہی سینکڑوں آیات ہیں جن میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالرسل کا تعلق ناقابل انقطاع ہے۔ جو شخص خدا کے رسولوں کا انکار کرتا ہے، اور ان کی تعلیم کو قبول نہیں کرتا، وہ چاہے خدا کو مانے یا نہ مانے دونوں حالتوں میں اس کی گمراہی یکساں ہے۔

کیونکہ خدا کے بارے میں جو اعتقاد علم کے بغیر قائم کیا جائے گا وہ ہرگز صحیح نہیں ہوگا خواہ وہ عقیدۂ توحید ہی کیوں نہ ہو۔

وحدت کلمہ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ صرف ایمان بالرسل ہی وہ چیز ہے جو بنی نوع انسان کو ایک عقیدہ پر جمع کر سکتی ہے۔ اختلاف کی بنا دراصل جہالت ہے۔ لوگ جس چیز کی حقیقت سے واقف نہ ہوں گے اس کے متعلق گمان کی بنا پر قیاس آرائیاں کریں گے اور لامحالہ ان کے درمیان اختلافِ رائے ہوگا؛ کیونکہ گمان اور قیاس کی مدد سے رائے قائم کرنا بالکل ایسا ہی ہے، جیسے اندھیرے میں ٹٹولنا۔ جہاں روشنی نہ ہوگی وہاں پچاس آدمی ایک چیز کو ٹٹول کر پچاس مختلف رائیں ظاہر کریں گے مگر روشنی آنے کے بعد کوئی اختلاف باقی نہ رہے گا اور سب آنکھوں والے ایک ہی نتیجہ پر متفق ہوجائینگے پس جب انبیاء علیہم السلام کو "علم" کی نعمت اور بصیرت کے "نور" سے بہرہ ور کیا گیا ہے، تو ممکن نہیں ہے کہ ان کی آراء میں اختلاف ہو، ان کی تعلیمات میں اختلاف ہو، یا ان کے طریقوں میں اختلاف ہو۔ اس لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ تمام انبیاء ایک ہی گروہ ہیں، سب کی تعلیم ایک ہے، سب کا دین ایک ہے، سب ایک ہی صراطِ مستقیم کی طرف بلانے والے ہیں، اور مومن کے لئے سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو شخص انبیاء میں سے کسی ایک نبی کی بھی تکذیب کرے گا وہ گویا تمام انبیاء کی تکذیب کا مجرم ہوگا۔ اور اس کے دل میں ایمان باقی نہ رہے گا؛ کیونکہ جس تعلیم کو وہ جھٹلا رہا ہے وہ محض اس ایک نبی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ بعینہٖ وہی تعلیم تمام انبیاء کی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ وَ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ

خدا نے پیغمبروں سے فرمایا کہ اے پیغمبرو! پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو اسے میں جانتا ہوں۔ اور یقیناً تمہارا گروہ دراصل ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم مجھ سے

زُبُرًا کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۲۳ : ۴)

ڈرتے رہو مگر بعد میں لوگوں نے آپس میں اختلاف کرکے اپنے مذہب الگ الگ بنالئے، اور اب حال یہ ہے کہ جس گروہ کے پاس جو چیز ہے اسی پر وہ خوش ہے۔

اِنَّا اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ کَمَا اَوْحَیْنَا اِلٰی نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ وَ اَوْحَیْنَا اِلٰی اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِیْسٰی وَ اَیُّوْبَ وَ یُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَیْمٰنَ وَ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَیْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَیْكَ وَ کَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا (۴ : ۲۳)

اے محمدؐ! ہم نے اسی طرح تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرح ہم نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیج چکے ہیں، اور اسی طرح ہمنے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور آل یعقوب اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی اور داوٗد کو زبور عطا کی۔ اور ہم ہی نے وہ رسول بھی بھیجے جن کا حال ہم اس سے پہلے تم کو بتا چکے ہیں اور وہ رسول بھی جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔ اور تم سے پہلے اللہ تعالیٰ موسیٰ سے بھی کلام کرچکا ہے۔

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات ظاہر کرتی ہیں کہ تمام انبیاء ایک ہی دین حق کی طرف بلانے آئے ہیں اور وہ ہر قوم کی طرف بھیجے جاچکے ہیں۔ وَلِکُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ (۱۰ : ۵) وَلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳ : ۱) ان میں سے جن نبیوں کا ذکر قرآن مجید میں تصریح کے ساتھ کیا گیا ہے ان پر تو تصریح کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے رہے وہ انبیاء و ہادیان امم جن کے نام ہمیں نہیں بتائے گئے ہیں تو ان کے متعلق صحیح اعتقاد یہ ہے کہ وہ سب اسلام ہی کے داعی تھے مگر قوموں نے ان کی تعلیمات کو بدل دیا اور "آپس میں اختلاف کرکے اپنے الگ الگ مذہب بنالئے"۔ ہم بودھ اور کرشن اور زردشت، اور کنفیوشس وغیرہم کو نبی اسلئے نہیں کہہ سکتے کہ ان کے متعلق قرآن میں تصریح نہیں ہے

لیکن ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ہندوستان چین، جاپان، ایران، افریقہ، یورپ اور تمام ممالک میں آئے ہیں۔ اور سب نے اسی اسلام کی طرف دعوت دی ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاتے ہیں پس ہم کسی قوم کے پیشوایان مذہب کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ ان غلط طریقوں کی تکذیب کرتے ہیں جو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹ گئے ہیں۔

انبیاء کے متعلق قرآن کی یہ تعلیم بے نظیر ہے کسی مذہب میں ایسی تعلیم موجود نہیں ہے۔ یہ صداقت قرآنی کی روشن دلیل ہے اور بنی نوع انسانی کے لئے اس میں اتفاق عالم اور وحدت کلمہ کا ایک سکون بخش پیغام مضمر ہے۔

اتباع واطاعت رسول رسالت کے اعتقاد کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف عقاید اور عبادات میں بلکہ زندگی کے تمام عملی مسائل میں بھی اس طریقہ کی پیروی کی جائے جس پر خدا کے رسول چلے ہیں، کیونکہ خدا نے جس "علم" اور نور بصیرت سے ان کو بہرہ ور فرمایا تھا اس سے غلط اور صحیح طریقوں کا فرق یقینی طور پر انھیں معلوم ہوجاتا تھا، اس لئے وہ جو کچھ ترک یا اختیار کرتے تھے، اور جو کچھ حکم دیتے تھے، وہ سب خدا کی طرف سے تھا۔ عام انسان سالہا سال بلکہ قرنہا قرن کے تجربات کے بعد بھی غلط اور صحیح کے امتیاز میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوتے، اور جو تھوڑی بہت کامیابی نصیب ہو بھی جاتی ہے تو وہ یقین کامل کی ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہوتی، بلکہ اس کی بنا محض قیاس واستقراء پر ہوتی ہے جس میں بہرحال غلطی کا اندیشہ باقی رہتا ہے۔ بخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام نے زندگی کے معاملات میں جو طریقے اختیار کئے اور جن پر چلنے کی تعلیم دی، وہ "علم" کی بنا پر اختیار کئے گئے تھے اس لئے ان میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بار بار انبیاء کی اطاعت اور ان کے اتباع کا حکم دیتا ہے ان کے قائم کئے ہوئے طریقے کو شریعت اور منہاج اور صراط مستقیم کہتا ہے، اور تاکید کرتا ہے کہ تمام دوسرے طریقوں کو چھوڑ کر اور تمام دوسرے لوگوں کی

اتباع ترک کر کے صرف انبیاء کا اتباع کرو اور انہی کے طریقے پر چلو، کیونکہ ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے، اور ان کا اتباع عین مرضات الٰہی کا اتباع۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ - (۴ : ۹)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴ : ۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (۳ : ۴) -

اے محمد کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کریگا اور تمہارے گناہ بخش دیگا، اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ کہو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو پھر اگر وہ روگردانی کریں تو یقین رکھو کہ اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ - (۸ : ۳)

اے ایمان لانے والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے ہرگز روگردانی نہ کرو۔ یہ بات خوب سن رکھو۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ کچھ نہیں سنتے۔ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے گونگے ہیں جو کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا - (۳۳ : ۵)

کسی مومن مرد کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کر دے تو ان کے لئے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ (۲۸ : ۵)	پھر اگر وہ تیری بات نہ مانیں تو جان لے کہ محض اپنی خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ اور اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا۔ جس نے خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کی۔

ایسی اور بیسیوں آیات ہیں جن میں اتباع و اطاعت رسول پر زور دیا گیا ہے۔ پھر سورہ احزاب میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے کہ رسول اللہ کی زندگی ان لوگوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے جو اللہ سے بخشش کی اور یوم آخر میں کامیابی کی امید رکھتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ (۲)

عقیدہ رسالت کی اہمیت اطاعت و اتباع کے ان احکام کے ساتھ رسالت کا عقیدہ درحقیقت اس تہذیب کی جان اس کی روح حیات اور قوت بقا، اور اس کے امتیازی خصائص کی بنائے اصلی ہے۔ جسے اسلام نے قائم کیا ہے۔ ہر تہذیب اور نظام تمدن میں تین چیزیں اساس کا حکم رکھتی ہیں۔ ایک طریق فکر۔ دوسرے اصول اخلاق، تیسرے قوانین مدنی۔ دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ تینوں چیزیں تین مختلف ذرایع سے آتی ہیں۔ طریق فکر ان مفکرین اور اہل حکمت کی تعلیمات سے ماخوذ ہوتا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی وجہ سے بڑے بڑے انسانی گروہوں کی ذہنیت پر قابو پالیا ہے۔ اصول اخلاق ان رہنماؤں مصلحوں، اور پیشواؤں سے لئے جاتے ہیں جن کو مختلف زمانوں میں خاص خاص قوموں پر اقتدار حاصل ہوا ہے اور قوانین مدنی کے وضع کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی مہارت پر زندگی کے مختلف شعبوں میں اعتماد کیا جاتا ہے اس طرح سے جو نظام تمدن قائم ہوتا ہے اس میں لازمی طور پر تین بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں۔

ا۔ ان تین مختلف ذرایع سے جو عناصر فراہم ہوتے ہیں ان سے ایک ایسی معجون مرکب تیار

ہوتی ہے جس کا مزاج کہیں صدیوں میں جا کر قائم ہوتا ہے، اور پھر بھی بہت سی بے ربطیاں، بے اعتدالیاں اور نامناسبتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ مفکرین اور اہل حکمت بہت سے ہیں، سب کے طریق فکر جدا جدا اور ایک دوسرے سے اصلاً مختلف ہیں، اور عموماً وہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو کبھی انسانی زندگی کے عملی مسائل سے کسی قسم کا مس نہیں رہا ہے، بلکہ ان میں سے اکثر تو اپنی مردم بیزاری کے لئے مشہور رہے ہیں۔ اس ماخذ سے اہل دنیا اپنا طریق فکر حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا عنصر جس گروہ سے لیا جاتا ہے اس میں بھی انفرادی تخیلات و افکار اور ذہنیتوں کے اعتبار سے کافی اختلاف پایا جاتا ہے اور اگر اس گروہ میں کوئی شئے مشترک ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس کے تمام افراد تخیل کی دنیا میں رہنے والے اور پرجوش جذباتی لوگ ہیں جو ٹھوس عملی مسائل سے بہت ہی کم تعلق رکھتے ہیں رہا تیسرا عنصر تو اس کے ماخذ بھی باہم مختلف ہیں۔ اور ان میں یہ چیز مشترک ہے کہ جذبات لطیف کی آنچ اندر بہت کمی ہے ضرورت سے زیادہ عملیت نے ان کو قسی القلب اور خشک بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے متضاد عناصر میں صحیح اور معتدل امتزاج قائم ہونا بہت مشکل ہے اور ان کا تضاد اپنا رنگ نمایاں کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

۲۔ ان ذرائع سے جو عناصر ثلاثہ حاصل ہوتے ہیں ان میں نہ طول حیات کی قوت ہوتی ہے اور نہ توسع کی استعداد۔ مختلف قوموں پر مختلف مفکروں، رہنماؤں اور مقننوں کے اثرات پڑتے ہیں اور ان کی وجہ سے ان کے طریقہائے فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی میں اصولی اختلافات واقع ہو جاتے ہیں۔ پھر ایک قوم پر بھی تمام زمانوں میں انہی مخصوص مفکروں، رہنماؤں اور مقننوں کا اثر قائم نہیں رہتا جنہوں نے ابتدا میں اس پر اثر ڈالا تھا، بلکہ اختلاف زمانہ کے ساتھ یہ مؤثرات اور ان کے اثرات بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح تہذیبیں ایک طرف تو قومی بن جاتی ہیں، اور ان کے اختلافات سے قومیتوں کا وہ اختلاف برانگیختہ ہوتا ہے جو دراصل خرمن امن کو پھونک دینے والی بجلی کا ہیولیٰ ہے

اور دوسری طرف ہر قوم میں بھی بجائے خود تہذیب و تمدن کا نظام دائماً ایک سیمابی کیفیت میں رہتا ہے اور اس میں ایک خط مستقیم پر نشو و نما ہونے کے بجائے ہمیشہ اساسی تغیرات واقع ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا سیلان کبھی ارتقا کی جانب ہوتا ہے اور کبھی انقلاب کی جانب۔

۳۔ عناصر ثلاثہ کے ان مبادی میں سے کسی میں بھی تقدس کا شائبہ نہیں ہوتا۔ قوم اپنے مفکرین سے جو طریق فکر، رہنماؤں سے جو اصول اخلاق، اور واضعین قانون سے جو قوانین مدنی لیتی ہے وہ سب انسانی اجتہاد کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کے نتیجۂ اجتہاد انسانی ہونے کا خود ان کے متبعین کو بھی احساس رہتا ہے، اس کا لازمی اثر یہ ہے کہ اتباع کبھی کامل نہیں ہوتا ...... متبعین اپنے انتہائی اتباع کی حالت میں بھی ایمانی کیفیت سے متکیف نہیں ہونے پاتے۔ وہ خود یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی تہذیب کے عناصر اصلیہ میں غلطی کا امکان اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ پھر تجربات بھی رفتہ رفتہ ان کی غلطیاں ثابت کرتے رہتے ہیں، جن سے شک اور تذبذب کی حالت رونما ہو جاتی ہے اس طرح کبھی کسی طریق فکر یا اصول اخلاق یا اصول قانون کو قوم پر اپنی پوری گرفت قائم کرنے اور نظام تمدن کو مستحکم کر دینے کا موقع نہیں ملتا۔

ایمان بالرسول کی بنیاد پر جو تہذیب قائم ہوئی ہے وہ ان تینوں خرابیوں سے پاک ہے اولاً اس میں تہذیب کے تینوں عنصر ایک ہی مبدا سے آتے ہیں ایک ہی شخص طریق فکر بھی مقرر کرتا ہے، اصول اخلاق بھی متعین کرتا ہے، اور قوانین مدنی کے اصول بھی وضع کرتا ہے۔ وہ بیک وقت دنیائے فکر، عالم اخلاق اور جہان عمل تینوں کا صدر انجمن ہوتا ہے، تینوں کے مسائل پر اس کی نظر یکساں رہتی ہے، اس میں تفکر، جذبات لطیف، اور حکمت عملی تینوں کی ایک معتدل آمیزش ہوتی ہے اور ان تینوں عنصروں میں سے ہر ایک کی مناسب مقدار لے کر [illegible] شامل کر دیتا ہے کہ کسی جز میں کمی بیشی نہیں ہوتی، اجزا میں کوئی باہم بے ربطی اور نامناسبت

نہیں پائی جاتی، اور مرکب کا مزاج غایت درجہ معتدل ہوتا ہے۔ یہ امر درحقیقت انسان کی استطاعت سے بالاتر ہے۔ فاطر کائنات کی ہدایت کے بغیر اس کا انجام پانا کسی طرح ممکن نہیں۔

ثانیاً اس میں کوئی عنصر قومی یا زمانی نہیں ہوتا۔ خدا کا رسول، جو طریق فکر، جو اصول اخلاق اور اصول قانون مقرر کرتا ہے وہ قومی رجحانات یا زمانی خصوصیات پر نہیں بلکہ صداقت اور حق پر مبنی ہوتے ہیں، اور حق وصداقت وہ شئے ہے جو مشرق اور مغرب، سیاہ اور سپید، سامی اور آرین، قدیم اور جدید کے جملہ قیود سے بالاتر ہے۔ جو چیز سچی اور برحق ہے وہ دنیا کے ہر گوشے، دنیا کی ہر قوم اور وقت وزمانہ کی ہر گردش میں یکساں سچی اور برحق ہے۔ آفتاب جاپان میں بھی آفتاب ہے اور جبل الطارق میں بھی۔ ہزار برس پہلے بھی آفتاب تھا اور ہزار برس بعد بھی آفتاب ہی رہے گا۔ پس اگر کوئی تہذیب عالمگیر بشری اور دائمی تہذیب بن سکتی ہے تو وہ رسول خدا کی قائم کی ہوئی تہذیب ہی ہے اور اسی میں یہ قابلیت موجود ہے کہ اپنے اصول واساس کو بدلے بغیر ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانے کے مناسب حال ہو سکتی ہے

ثالثاً یہ تہذیب پوری تقدس کی شان لئے ہوئے ہے، اس کا متبع یہ اعتقاد بلکہ ایمان رکھتا ہے کہ جس نے اس تہذیب کو قائم کیا ہے وہ خدا کا رسول ہے، اس کے پاس خدا کا بخشا ہوا علم ہے اس کے علم میں شک کا شائبہ تک نہیں (لَارَیْبَ فِیْہِ) اس کی باتوں میں، نہ ظن وتخمین کو دخل ہے اور نہ ہوائے نفس کو، وہ جو کچھ پیش کرتا ہے خدا کی طرف سے پیش کرتا ہے، اس کے بہک جانے اور غلط راستوں پر چل نکلنے کا کوئی امکان نہیں، مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی (۵۳: ۱)۔ یہ یقین وایمان جب متبع رسول کے رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے تو وہ پورے اطمینان قلب کے ساتھ رسول کا اتباع کرتا ہے۔ اس کے دل میں کوئی شک اور تذبذب نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں

اندیشہ کبھی خلجان پیدا نہیں کرتا کہ شاید یہ طریقہ صحیح نہ ہو۔ کوئی اور راستہ برحق یا کم از کم اس سے زیادہ بہتر ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی تہذیب غایت درجہ پائدار ہوگی۔ اس کا اتباع نہایت مضبوط ہوگا۔ اس میں دنیوی تہذیبوں سے زیادہ ڈسپلن پایا جائیگا۔ اس کے طریق فکر، اصول اخلاق اور قوانین مدنی میں زیادہ استحکام ہوگا۔

انبیاء علیہم السلام اسی تہذیب کے معمار تھے۔ صدیوں تک وہ دنیا کے ہر خطے میں اس کے لئے زمین تیار کرتے رہے۔ اور جب زمین پوری طرح تیار ہوگئی تو محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آکر اس کی عمارت مکمل کردی۔ (باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر

از جناب ذوقی شاہ صاحب

(۲)

توریت اور عہد عتیق کے دیگر صحف انبیاء کا اپنی اصلی اور ابتدائی صورتوں میں نہ رہنا تو واقعات مندرجہ مضمون ماقبل سے بخوبی روشن ہے۔ اطمینان مزید کے لئے آؤ ذرا ان کتابوں کے اندرونی نقشوں پر بھی نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کی اندرونی شہادت کس جانب اشارہ کرتی ہے۔

کتب عہد عتیق کے اجزائے ترکیبی موجودہ مروجہ عہد عتیق میں جو انتالیس (۳۹) کتابیں شامل ہیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) پیدائش یا تکوین۔ (۲) خروج۔ (۳) احبار۔ (۴) گنتی یا اعداد۔ (۵) استثنا یا توریت مثنیٰ۔ (۶) یشوع یا یوشع۔ (۷) قاضیون یا قضاۃ۔ (۸) روت یا رعوت (۹) سموئیل اول یا صموئیل اول۔ (۱۰) سموئیل دوم یا صموئیل دوم۔ (۱۱) سلاطین اول یا ملوک اول۔ (۱۲) سلاطین دوم یا ملوک دوم۔ (۱۳) تواریخ اول یا ملوک اول۔ (۱۴) تواریخ دوم یا ملوک دوم۔ (۱۵) عزرا۔ (۱۶) نحمیاہ (۱۷) آستر یا اشتیر۔ (۱۸) ایوب (۱۹) زبور۔ (۲۰) امثال سلیمان۔ (۲۱) واعظ۔ (۲۲) غزل الغزلات (۲۳) یشعیاہ۔ (۲۴) یرمیاہ۔ (۲۵) نوحۂ یرمیاہ۔ (۲۶) حزقی ایل یا حزقیل۔ (۲۷) دانیال۔ (۲۸) ہوسیع۔ (۲۹) یوئیل۔ (۳۰) عاموس یا عموس۔ (۳۱) عبدیاہ۔ (۳۲) یونہ۔ (۳۳) میکہ یا میکاہ۔ (۳۴) نحوم۔ (۳۵) حبقوق۔ (۳۶) صفنیاہ۔ (۳۷) حجی۔ (۳۸) ذکریاہ۔ (۳۹) ملاکی۔

علاوہ کتب مندرجہ بالا کے سترہ (۱۷) کتابیں ایسی ہیں جو ایک زمانہ میں موجود تھیں اور اب ناپید ہیں مگر انکا ذکر اور اُن کے حوالے عہد عتیق کے موجودہ مجموعہ میں اب بھی موجود ہیں اور کوئی شخص ان کے صحیح اور معتبر ہونے سے اور اس بات سے کہ وہ ایک زمانہ میں موجود تھیں انکار نہیں کرسکتا۔ چنانچہ ان کتابوں کے نام معہ اُن آیات کے حوالوں کے جن میں اُن کا ذکر آیا ہے ذیل میں درج ہیں

نمبر	نام کتب گم شدہ	حوالجات عہد عتیق موجودہ
۱	کتاب عہد نامہ موسیٰ	خروج۔ باب ۲۴۔ آیہ ۷۔
۲	جنگ نامہ خداوند۔	گنتی۔ باب ۲۱۔ آیہ ۱۴۔
۳	کتاب الیاشر	سموئیل دوم باب ۱۔ آیہ ۱۸۔ اور یشوع۔ باب ۱۰۔ آیہ ۱۳
۴۔	کتاب یاہو بن حنانی	تواریخ دوم۔ باب ۲۰۔ آیہ ۳۴۔
۵	کتاب سمعیاہ نبی۔	تواریخ دوم۔ باب ۱۲۔ آیہ ۱۵۔
۶	کتاب اخیاہ نبی	تواریخ دوم۔ باب ۹۔ آیہ ۲۹۔
۷	کتاب ناتن نبی	تواریخ دوم۔ باب ۹۔ آیہ ۲۹
۸	کتاب مشاہدات عیدو غیب بین۔	تواریخ دوم۔ باب ۹۔ آیہ ۲۹
۹	کتاب اعمال سلیمان۔	سلاطین اول۔ باب ۱۱ آیہ ۴۱
۱۰	کتاب یسعیاہ بن اموص	تواریخ دوم۔ باب ۲۶۔ آیہ ۲۲
۱۱	کتاب مشاہدات یسعیا بن اموص	تواریخ دوم۔ باب ۳۲۔ آیہ ۳۲
۱۲	سموایل غیب بین کی تواریخ۔	تواریخ اول۔ باب ۲۹۔ آیہ ۲۹ و ۳۰۔
۱۳	نغمات سلیمان ایک ہزار پانچ۔	سلاطین اول۔ باب ۴۔ آیہ ۳۲ و ۳۳
۱۴	سلیمان کی کتاب خواص نباتات وحیوانات	سلاطین اول۔ باب ۴۔ آیہ ۳۲ و ۳۳۔

۱۵	کتاب امثال سلیمان (یہ تین ہزار امثال اُن سے مختلف ہیں جو موجودہ عہد عتیق میں درج ہیں)	سلاطین اول۔ باب ۴ ۔ آیہ ۳۲
۱۶	جا و غیب بین کی تواریخ۔	تواریخ اول۔ باب ۲۹ ۔ آیہ ۲۹۔
۱۷	مرثیہ یرمیاہ (یہ مرثیہ اس نوحہ یرمیاہ سے مختلف ہے جو بائبل میں درج ہے بقول بشپ میٹرک یہ مرثیہ اب گم ہے)	تواریخ دوم۔ باب ۳۵ ۔ آیہ ۲۵۔

ان سترہ کتابوں کے علاوہ اور بھی چند کتابیں تھیں جنہیں صحیح و مستند سمجھا جاتا تھا۔ مگر وہ اب معدوم ہیں چنانچہ بڑے بڑے مسیحی علماء کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا ہے۔ ہمفڈرڈ صاحب اپنی کتاب ''سوالات'' مطبوعہ لندن ۱۸۴۳ء میں سوال دوم کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ :۔ ''یہ کتابیں جنمیں حضرت مسیح علیہ السلام کو ناصری کہا گیا ہے (اور جس کا ذکر مقدس متی نے باب ۲ ۔ آیہ ۲۳ میں کیا ہے) نیست و نابود ہوگئی ہیں اس لئے کہ جو کتابیں نبیوں کی اب موجود ہیں ان میں کسی میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ناصری نہیں لکھا ہے۔''

گریز اسٹم صاحب اپنی ہوملی یعنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ :۔ ''پیغمبروں کی بہت سی کتابیں ناپید ہوگئیں اس لئے کہ یہودیوں نے غفلت سے بلکہ بیدینی سے بعض کتابوں کو کھو دیا اور بعض کو پھاڑ ڈالا اور بعض کو جلادیا۔''

یہوداہ کے خط (عہد جدید) آیہ ۹ میں لکھا ہے کہ :۔ ''جب میکائیل نے شیطان سے تکرار کرکے موسیٰ کی لاش کی بابت بحث کی''۔ ظاہر ہے کہ یہوداہ نے یہ واقعہ توریت ہی سے لیا ہوگا۔ مگر موجودہ توریت میں اس واقعہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔

تھطاوس دوم باب ۲ آیہ ۸ میں ہے کہ : ’’یانامس اور یمبراس نے موسیٰ کا سامنا کیا‘‘ مگر یہ دونوں نام موجودہ عہد عتیق میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

یہوداہ نے اپنے خط کی آیۃ ۱۴ و ۱۵ میں حنوک کی پیشین گوئی کا جو ذکر کیا ہے وہ آجکل کی توریت میں کہیں مندرج نہیں۔

زبور ۱۰۵ آیہ ۱۸ میں یوسف علیہ السلام کی بیکڑیوں اور بیڑیوں کا جو حال درج ہے اُس کا بھی توریت میں کہیں ذکر نہیں ہے

تفسیر ڈائلی مطبوعہ ۱۸۴۶ء جلد ۲ صفحہ ۱۳۹ پر درج ہے کہ :۔
’’اس بادشاہ روشن ضمیر یعنی سلیمان نے اُس دانائی کو جو اُس نے پائی انسانوں کے فائدہ کے لئے استعمال میں لانا چاہا اور بہت سی کتابیں اُن کی تعلیم کے لئے لکھیں مگر حضرت عزرا نے اُن میں سے صرف تین کو مقدس کتابوں میں داخل کیا اور بقیہ کتابیں (جو کتب مقدسہ میں داخل نہیں کی گئیں) یا تو مذہبی تربیت کے لئے نہیں لکھی گئیں تہیں یا ایک زمانہ کے گذر جانے کے باعث خراب اور ناقص ہو گئیں تہیں‘‘

نمونہ کے طور پر اس قسم کی صرف چند ہی مثالیں اوپر درج کی گئیں ہیں۔

غرضکہ یہ امر یقینی ہے کہ علاوہ اُن سترہ (۱۷) کتب مقدسہ کے جن کی فہرست دیجا چکی ہے اور بھی مقدس کتابیں ایسی تہیں جن کا کسی زمانہ میں وجود تھا مگر اب عرصہ سے ناپید ہیں۔ ان کتابوں کے الہامی نہ ہونے پر کوئی دلیل نہیں کم از کم ان کتابوں کا اُتنا ہی الہامی ہونا ضروری ہے جتنا الہامی کہ موجودہ مروجہ کتابوں کا ہونا بیان کیا جاتا ہے کیونکہ کوئی الہامی مصنف اپنی الہامی کتاب میں نہ اُن کتابوں سے استخراج کر سکتا ہے نہ اُن کے حوالے دے سکتا ہے نہ ان کے مضامین کی تصدیق کر سکتا ہے جو کہ الہامی نہ ہوں یا جن کو وہ جھوٹا یا جعلی سمجھتا ہو۔

علاوہ کتب متذکرہ بالا کے پینتیس (۳۵) کتابیں ایسی ہیں جو کسی زمانہ میں عہد عتیق میں داخل تھیں مگر اب جعلی سمجھی جاتی ہیں۔ اور بائیبل سے خارج کر دی گئیں ہیں۔ ان میں سے چند کتابیں ایسی ہیں جنھیں عیسائیوں کے بعض فرقے اب تک مانتے چلے جاتے ہیں اور بعض فرقے نہیں مانتے اور چند کتابیں ایسی ہیں جنھیں بالاتفاق جملہ فرقہائے مسیحی جعلی قرار دیتے ہیں۔ مگر یہ سب کتابیں عہد عتیق کے یونانی ترجمہ سپٹواجنٹ یعنی سبعینیہ میں جو ۲۸۴ برس قبل مسیح تیار ہوا تھا موجود ہیں اور یونانی اور رومی کلیسا کے نزدیک مقدس ہیں بلکہ اُن میں سے بعض کی تلاوت بھی اب تک جاری ہے۔ پراٹسٹنٹ کلیسا نے ان کو خارج کر دیا ہے اور ان کا نام "اپوکریفہ" یعنی جعلی رکھدیا ہے اگرچہ علمائے یورپ اب بھی اُن کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعہ عیسیٰ علیہ السلام سے تین سو برس پیشتر کی تاریخ پر کافی روشنی پڑتی ہے اور تورات و اناجیل کے درمیان یہ کتابیں برزخ کا کام دیتی ہیں ان کتابوں میں سے بعض بعض میں چند ایسے مضامین بھی ہیں جن کا حوالہ قرآن شریف میں پایا جاتا ہے مگر جن کو مروجہ عہد عتیق کی کتابوں سے خارج کر دیا گیا ہے یا مبہم طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ آزر سے مناظرہ جو سورہ انعام میں مذکور ہے۔ توریت کی کتاب پیدائش میں کہیں بیان نہیں کیا گیا حالانکہ جعلی قرار دی ہوئی خارج شدہ کتاب جوبلی کی آیہ ۱۲ میں یہ مناظرہ بجنسہ موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان "جعلی" کتابوں میں سے بیشتر کتابیں حقیقتاً جعلی ہیں۔ اسکندر کے جانشینوں کے عہد میں جب ایک طرف یہود اپنی آزادی قائم رکھنے کیلئے جدوجہد میں مصروف تھے تو دوسری طرف انہیں یہود کے اندرونی فرقوں میں آپس میں مناظروں اور مناقشوں اور مجادلوں کا بازار بھی گرم تھا اور لوگوں نے اپنے مدعا کے مطابق کتابیں تصنیف کر کے اُن کو انبیائے بنی اسرائیل کے نام سے منسوب کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہود کی دیکھا دیکھی بعد مسیح نصاریٰ نے بھی یہی روش اختیار کر لی تھی، اور واقعات آئندہ وظہور مسیح کی پیشین گوئیوں سے لبریز کتابوں کا اپنی حسب دلخواہ عبارات میں لکھنا شروع کر دیا تھا

یہ جملہ واقعات کھلی ہوئی تفسیر ہیں مندرجہ ذیل آیت قرآنی کی :۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۔ (البقر ۔ع ۹) ۔	"پس وائے برحال ان لوگوں کے جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے تاکہ بیچیں اس کو تھوڑے مول پر پس خرابی ہے اُن کو اپنے ہاتھ کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کمائی سے "

ان سینتیس متروک کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں :۔

نمبر	کتب متروکہ	نمبر	کتب متروکہ
۱تا۷	کتب سبعہ شیث۔	۱۸	کتاب توبٹ
۸	کتاب حنوک ۔	۱۹	کتاب جوتھ
۹	کتاب مشاہدات ابراہیمؑ ۔	۲۰	بقیہ ابواب استر
۱۰	کتاب مشاہدات موسیٰؑ	۲۱	کتاب سلیمان کی دانائی ۔
۱۱	کتاب پیدایش صغیر	۲۲	کتاب الواعظ
۱۲	کتاب قیاس موسیٰ	۲۳	کتاب باروق
۱۳	کتاب الوصیت موسیٰ ۔	۲۴	کتاب تاریخ سسینا
۱۴	کتاب اسرار موسیٰ ۔	۲۵	تین معصوم بچوں کا نغمہ
۱۵	کتاب معراج موسیٰ ۔	۲۶	تاریخ بربادی بل اور ڈرگن ۔
۱۶	کتاب عزرا نمبر ۱ ۔	۲۷	دعائے منیس شاہ یہودیہ
۱۷	کتاب عزرا نمبر ۲	۲۸	کتاب مقابیں ۔ اول ۔

۲۹ کتاب مقابیں دوم

۳۰ کتاب معراج اشعیاہ

۳۱ ملفوظات حبقوق۔

۳۲ کتاب لوئیل۔

۳۳ کتاب جوبلی۔

۳۴ کتاب حزقیل بابت یروسلم۔

۳۵ کتاب حزقیل بابت صدقیاہ اور بابل۔

بعض عیسائی مصنفین ہی نے انہیں تین مندرجہ ذیل کتب کا اور اضافہ کیا ہے۔

۳۶ سموئیل کی وہ کتاب جس کا ذکر سموئیل اول باب ۱۰۔ آیہ ۲۵ میں آیا ہے۔

۳۷ ہوسیاہ جس کا ذکر تواریخ دوم باب ۳۳ آیہ ۱۹ میں آیا ہے۔

۳۸ عیدو نبی کی تفسیر جس کا ذکر تواریخ دوم باب ۱۳۔ آیہ ۲۲ میں آیا ہے۔

متذکرۂ بالا اڑتیس (۳۸) کتابوں کو اول الذکر سترہ گمشدہ کتابوں کے ساتھ شامل کیا جائے تو کل پچپن کتابیں ہوئیں جو کسی زمانہ میں عہد عتیق میں داخل تھیں مگر اب خارج ہیں۔

نسخوں میں اختلاف

عہد عتیق کی کتابوں پر سات تباہیاں تو دشمنوں کے ہاتھ سے وارد ہوئیں کہ ہر مرتبہ بائبل ناپید ہوی اور ہر مرتبہ لوگوں نے کچھ حافظہ سے کچھ سن سنا کر کچھ اپنے ذاتی قیاس سے کچھ مصلحت وقت سے جو چاہا لکھ لیا اور اسے بائبل قرار دیدیا۔ آٹھویں تباہی دوسری یعنی خود یہودیوں ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی پچپن کتابوں کو انہوں نے کتب مقدسہ سے خارج کردیا بعض کو جعلی قرار دیدیا بعض حقیقتاً جعلی تھیں جنہیں ایک عرصہ تک اُنہوں نے کتب مقدسہ میں شامل رکھا۔ اور بعد میں خارج کردیا۔ اور بعض کو ایسا ناپید کردیا کہ اُن کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا تھیں اور کیسی تھیں۔ اب اُنتالیس مروّجہ کتابیں جو آج موجود ہیں ان کی بابت کیا اطمینان ہوسکتا ہے کہ یہ کس حد تک معتبر ہیں؟ اول تو ان کے قدیم نسخے ہی مفقود ہیں۔ دوم ان کی جو جدید نقول میسر بھی ہیں اُن میں بکثرت اختلافات ہیں۔ پھر ایسی حالت میں جب قوم میں حفاظ کلام الٰہی بھی

وجود نہ ہو اُس کی کتب مقدمہ کے تحریفات لفظی ومعنوی سے محفوظ ہونے کے متعلق کیا اطمینان ہوسکتا ہے

قدیم نسخوں کی مفقودی کے متعلق ریورنڈ ہارن صاحب اپنی کتاب دیباچہ علوم بائبل جلد ۲۔ حصہ اول باب ۲ فصل اول میں لکھتے ہیں کہ :۔

"عہد عتیق کی کتابیں دراصل عبرانی زبان میں ہیں اور وہ دو ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ ایک آٹو گرافس یعنی وہ کتابیں جن کو خود الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا۔ اُن میں کے سب نسخے ناپید ہوگئے۔ کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ دوسرے اپوگرافس یعنی وہ نسخے جو اصلی نسخوں سے نقل ہوئے تھے اور مکرر سہ کرر نقل ہوتے ہوتے بہت کثرت سے پھیل گئے تھے۔ یہ پچھلے نسخے بھی دو قسم کے تھے۔

(۱) پرانے جو یہودیوں میں بہت معتبر اور سندی گئے جاتے تھے مگر یہ نسخے بھی مدت سے معدوم ہوگئے ہیں۔

(۲) نئے جو سرکاری کتب خانوں یا لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ یہ بھی دو قسم کے ہیں۔ اول رولز یعنے وہ قلمی صحیفے جو معابد میں کام آتے ہیں۔ دوم اسکویر مینو سکرپٹس یعنی وہ قلمی نسخے جو مربع تقطیع پر لکھے ہیں اور عام لوگوں کے کام میں آتے ہیں"

اب ان نسخوں کا بھی حال سن لیجئے بقول ڈاکٹر جان مکڈول کے جن کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ بھی امریکن مشن پریس لدھیانہ سے شایع ہوچکا ہے چھٹی اور دسویں صدی کے درمیان یہودیوں کے دو مدرسے تھے۔ ایک بابل میں جو مشرق میں ہے۔ دوسرا ٹائیبریس میں جو مغرب میں ہے۔ ان دونوں مدرسوں میں یہودیوں کے علم کا بڑا چرچا تھا اور کتب مقدسہ بہت کثرت سے نقل کی جاتی تھیں۔ اس سبب سے یہودیوں میں کتب مقدسہ کی دو قسمیں ہوگئیں۔ جو نسخے پہلے مدرسہ

میں مروج تھے اورینٹل ریڈنگ (یعنی مشرقی نسخے) کہلائے اور جو دوسرے مدرسوں میں مروج تھے آکسی ڈینٹل ریڈنگ (یعنی مغربی نسخے) کہلائے۔ آٹھویں یا نویں صدی میں ان دونوں نسخوں کا مقابلہ ہوا اور اُن میں جو اختلافات پائے گئے ان کی تعداد مختلف طور پر (۲۱۰) اور (۲۱۶) اور (۲۲۰) بیان کی جاتی ہے۔ گیارہویں صدی کی ابتدا میں ان دونوں مدرسوں کے فاضل پرلیڈنٹوں نے پھر مشرقی اور مغربی قلمی نسخوں کا مقابلہ کیا۔ اس مرتبہ اختلافات کی تعداد (۸۶۴) نکلی۔ پھر فادر مارن صاحب نے نہایت دلیری سے عبرانی قلمی نسخوں کی غلطیاں ثابت کیں۔ پھر لوئیس کیپل صاحب نے بہت سی غلطیاں نکالیں۔ پھر بشپ والٹن صاحب نے لوئیس کیپل کی تائید کرتے ہوے اس امر پر زور دیا کہ عبری عہد عتیق کی تصحیح کے لئے کوئی اچھا قاعدہ بنانا چاہئے۔ سترہویں صدی میں یہ بات عام طور سے قرار پا گئی کہ بغرض تصحیح عبری عہد عتیق کے نسخوں کے از سرنو مقابلہ کی اشد ضرورت ہے۔ عہد عتیق کی کتابیں پہلی مرتبہ ۱۴۸۸ء میں چھاپی گئیں تھیں جب وانڈر ہوٹ نے ۱۷۰۵ء میں ان کی طبع ثانی کا اہتمام کیا تو اسے بارہ ہزار جگہ طبع اول سے اختلاف کرنے کی ضرورت پیش آئی مگر باوجود اس ساری کوشش اور جدوجہد کے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ مسیحی علماء سے بھی مخفی نہیں ریورنڈ ہارن صاحب اپنی کتاب جلد اول کے صفحہ ۶۸ پر لکھتے ہیں کہ:- "الحاق کے باب میں یہ قبول کرنا پڑے گا کہ توریت میں الحاقی فقرے موجود ہیں"۔ ان الحاقی اور مشکوک کتابوں سے بالآخر پریشان ہوکر جان کیٹو۔ اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ:- "یہی کافی نہیں کہ جن مقامات کو ہم غلط سمجھیں اُنہیں کو الحاقی مانیں اور باقی کو بلا کم وکاست صحیح جانیں بلکہ ممکن ہے کہ جنہوں نے الحاق کیا ہے اونہوں نے باقی حصوں میں بھی تصرف کیا ہو۔"

انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (طبع جدید) میں بھی "بائیبل" پر جو مضمون ہے اُس میں لکھا ہے کہ:- عرصہ دراز تک کتب مقدسہ کا مطالعہ جرح وتعدیل کے مستند اصول سے محروم رہا۔

یہود محض اُس عبرانی نسخے کی پیروی کرتے تھے جس کی نسبت یہ مشہور تھا کہ غالباً دو
دوسری صدی عیسوی میں جمع کیا گیا اور بعد از ان احتیاط سے محفوظ رکھا
گیا لیکن اُس نسخہ میں چند تحریفیں تو ایسی ہیں جو اب صاف نظر آتی ہیں اور
غالباً ایک کافی تعداد تک ایسی تحریفیں اور بھی موجود ہیں جنکی شاید اب یا کبھی
پورے طور سے قلعی نہ کھل سکے عیسائی اور اسکندریہ کے یہود علما کی حالت اُس
سے بھی بدتر تھی کیونکہ پانچویں صدی عیسوی تک شاذ و نادر اور استثنا کے
ساتھ اور پانچویں صدی سے پندرہویں صدی تک بلا استثنا ان بزرگوں
نے تمامتر ترجموں ہی پر اکتفا کیا ہے"

ترجمے اب ذرا اس بات پر نظر ڈال لینے کی بھی ضرورت ہے کہ ترجموں نے بائبل کے ساتھ کیا
سلوک کیا اور بائبل والوں نے ترجموں کے ساتھ کیا معاملہ برتا۔

بادشاہ مصر بطلیموس فلاد لفیوس (۲۸۵ تا ۲۴۷ قبل مسیح) نے اپنے مشہور کتبخانہ اسکندریہ
کے لئے کتب عہد عتیق کا یونانی زبان میں ترجمہ چاہا۔ چنانچہ اُس نے زر کثیر صرف کیا۔ اپنے دو عالیقدر
مصاحبوں کا وفد یروشلم میں کاہنوں کے سردار کے پاس روانہ کیا کہ وہاں سے وہ کتب مقدسہ
کی نقل لاوے اور ۷۲ بہتر یہودی علمار ایسے لاوے جو عبرانی اور یونانی زبانوں پر کافی قدرت
رکھتے ہوں تاکہ یونانی زبان میں اُن کتابوں کا ترجمہ کر سکیں۔ وفد کامیاب واپس آیا۔ ۷۲ بہتر علما
نے کتب مقدسہ کا یونانی زبان میں ترجمہ کیا اور اُس ترجمہ کا نام سیپٹواجنٹ (Septuagint)
رکھا گیا۔ یہ ترجمہ سب سے زیادہ مستند اور پرانا بیان کیا جاتا ہے مگر اس کے متعلق مفسرین
بائبل میں اس درجہ اختلاف ہے کہ۔

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

بعض لوگ اسے (۷۲) علماء کا ترجمہ بتلاتے ہیں اور بعض صرف (۷۰) ہی علماء کی تعداد بیان کرتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ (۲۰۰) برس قبل مسیح یہ ترجمہ ہوا۔ بعض (۲۷۰) برس بعض (۲۸۵ یا ۲۸۶) برس اور بعض (۳۰۰) برس قبل مسیح اس کا ہونا بیان کرتے ہیں۔ پھر ان ستر یا بہتر علماء کے نام تک سے بھی کوئی واقف نہیں چہ جائیکہ اُن کے حالات، فضیلتِ علمی اور تقوے سے کوئی واقف ہو۔ مزید برآں جن صورتوں اور حالات میں اس ترجمہ کا کیا جانا ظاہر کیا جاتا ہے اُس میں بھی سخت اختلافات ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ (۷۲) علماء نے (۷۲) دن میں اس ترجمہ کو پورا کر دیا۔ بعض کہتے ہیں کہ (۷۰) علماء کو علیحدہ علیحدہ بند کر دیا گیا۔ اُنھوں نے علیحدہ علیحدہ ترجمہ کیا اور بعد میں جب مقابلہ کیا گیا تو لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً سب باہم مطابق نکلے۔ بعض کہتے ہیں کہ (۷۲) عالموں سے دو دو کو (۳۶) مکانوں میں بند کر دیا گیا۔ ہر مکان میں پہلے دونوں عالم الگ الگ ترجمہ کرتے تھے پھر آپس میں مقابلہ اور بحث کے بعد اپنے ترجموں میں تطبیق دے لیتے تھے۔ اس طرح (۳۶) ترجمے تیار ہوئے اور مقابلہ کیا گیا تو سب لفظاً اور حرفاً مطابق نکلے۔ بعض کا قول ہے کہ سارے علماء الگ ترجمہ کرتے تھے۔ پھر آپس میں ملتے تھے اور ترجموں کا مقابلہ کرتے تھے اور بحث کر کے صحیح بات ٹھیراتے تھے۔ اور اُسے ڈی تروس کاتب سے لکھوا لیتے تھے۔ بعض کا کہنا یہ ہے کہ یہ ترجمہ متفرق لوگوں نے متفرق طور پر مختلف اوقات میں کیا۔ ریورنڈ ہارن صاحب فرماتے ہیں کہ "اس انبار کذب میں ایک سچ دبا ہوا ہے جو بہ آسانی تحقیق نہیں ہو سکتا۔ پس ہم کو جائز ہے کہ ان روایتوں میں سے ایک کی طرف بھی التفات نہ کریں"۔ پھر اس ترجمہ کے متعلق ہارن صاحب نے صاف لکھدیا ہے کہ "اس نامہ کی سچائی پر بڑی گفتگو ہے جعلی ہونے کی صورت میں بھی یہ جعل بہت پرانا ہے کیونکہ مورّخ جوسیفس نے بھی اپنی تاریخ میں اُس کا ذکر کیا ہے۔ سترہویں اٹھارویں صدی سے قبل اُس نامہ کی سچائی پر گفتگو نہ تھی۔ مگر سترہویں اٹھارویں صدی میں اُس کی سچائی پر بڑی گفتگو ہوئی اور

ہمارے جمہور علماء کا اس کے جعلی ہونے پر اتفاق ہوگیا۔"

سریانی زبان میں بھی ایک ترجمہ جو پیشیٹو (Peshito) کے نام سے مشہور ہے نہایت قدیم سمجھا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ کا ترجمہ ہے بعض اسے جروم صاحب کا ترجمہ بتلاتے ہیں۔ بعض اسے زمانۂ آسا سے متعلق کرتے ہیں جو کہ سامریوں کا پرست تھا۔ بعض اسے تہدیس حواری کے زمانہ کا قرار دیتے ہیں۔ سریا کے گرجوں میں اس آخری روایت ہی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر زمانۂ حال کے نکتہ چین حضرات اس کو قریبی زمانہ ہی کا قرار دیتے ہیں بشپ والٹن اور کارپ روز صاحب اور سیوسڈن صاحب اور بشپ لوتھا اور ڈاکٹر کنی کاٹ اسے اول صدی عیسوی کا ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ بابر صاحب اور چند دیگر جرمن علماء اسے دوسری یا تیسری صدی کا کہتے ہیں۔ اور ڈراسی صاحب اسے بہت قدیم تبلاتے ہیں مگر کوئی تاریخ نہیں مقرر کرتے۔ اس ترجمہ میں زبور کی ابتداء میں جو تمہید دی گئی ہے وہ نہایت واضح طور پر کسی عیسائی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ترجمہ عبرانی سے سریانی میں ہوا۔ اور ترجمہ کا یہ انداز دیکھکر جبن صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ایک شخص کا کیا ہوا نہیں ہے بلکہ متعدد اشخاص کا کیا ہوا ہے۔

جو ترجمے کہ نہایت قدیم معتبر اور مشہور شمار ہوتے ہیں۔ ان کی یہ کیفیت ہے کہ نہ اُن کے زمانہ کا کچھ ٹھیک ہے نہ ترجمہ کرنے والوں کا صحیح حال کسی کو معلوم ہے جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے سب اٹکل سے ہے کسی قول کی تائید میں کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں کسی بات پر یقین کرنے کے لئے کوئی دلیل تعین زمانہ میں جو اختلافات واقع ہوئے ہیں وہ دس بیس سال نہیں بلکہ سینکڑوں برس کا تفاوت ظاہر کرتے ہیں مثلاً سریانی ترجمہ پیشیٹو کے بارہ میں سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر دوسری اور تیسری صدی عیسوی تک کا تفاوت ظاہر ہو رہا ہے اور زبور کی عیسائی تمہید پر غور کیا جائے تو یہ تفاوت دو چار سو برس کا نہیں بلکہ بارہ تیرہ سو برس کا ہو جاتا ہے۔ باوجود اس کے سپٹو اجنٹ یعنی یونانی ترجمہ نسخہ

سبعینیہ نے وہ مقبولیت حاصل کی کہ عبادت خانوں میں بجائے عبرانی توریت کے اسی کی تلاوت ہونے لگی اور صدیوں تک ہوتی رہی۔ دوسری زبانوں میں ترجمے اصل عبری سے نہیں بلکہ اسی یونانی نسخے سے ہونے لگے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیوں نے ترجمہ سبعینیہ سے پیشینگوئیاں نکال نکال کر یہودیوں پر رسالت مسیح ثابت کرنی شروع کی تو یہود چیخ اٹھے اور کہنے لگے کہ یہ ترجمہ معتبر نہیں۔ چنانچہ اس کے بعد چند یہودیوں نے ایک ترجمہ کرنے پر کمر باندھی۔

ان چند یہودیوں میں کے پہلے شخص کا نام اقویلہ تھا۔ یہ یہودی تھا عیسائی بن گیا تھا۔ بعد میں عیسایت سے منحرف ہوکر پھر یہودی ہوگیا۔ اس نے نسخہ سبعینیہ پر یہ اعتراض کیا کہ یہ ترجمہ لفظی نہیں چنانچہ ۱۲۹ء میں اپنی طرف سے ایک "لفظی ترجمہ" بھی پیش کر دیا۔ اس کے بعد دوسرے یہودی تہیودوشن نے اقویلہ کے ترجمہ کو یہ کہکر رد کر دیا کہ یہ فقط لفظی ترجمہ ہے۔ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ با محاورہ ترجمہ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ۱۷۵ء میں اس نے با محاورہ ترجمہ کیا۔ یہ شخص دراصل ملحد تھا یہودی بن گیا تھا پھر تیسرا شخص میدان میں آیا جس کا نام سمکوس تھا اور اس نے تہیودوشن سے بھی زیادہ آزادی کے ساتھ ایک "با محاورہ ترجمہ" کرکے ۲۰۰ء میں پیش کر دیا۔ یہ شخص پہلے سامری تھا۔ پھر یہودی ہوگیا تھا۔ بقول مسٹر چارلیز ڈارمین کے اس شخص نے اپنے ترجمہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کی درپردہ اہانت کی ہے۔

اب نسخہ سبعینیہ یہودی عبادت گاہوں سے نکالا گیا اور اس کی جگہ ان تینوں جدید ترجموں نے لی۔ آگے چلکر ان ترجموں کی نقلوں میں بھی اختلاف ہونے لگا۔ اور مختلف ترجموں کی عبارتیں آپس میں خلط ملط ہوگئیں۔

اس حالت کو دیکھکر اوریجن نے ۲۳۱ء میں ایک کتاب تیار کی جس کا نام ہیکسپلا (Hexapla) رکھا۔ مسٹر چارلیز ڈال مین لکھتے ہیں کہ۔ "اس کتاب میں چھ خانے رکھے گئے

پہلے خانہ میں عبری کو عبری حرفوں میں دوسرے خانہ میں عبری کو یونانی حرفوں میں تیسرے خانہ میں ترجمہ اقویلہ۔ چوتھے خانہ میں ترجمہ سمکوس پانچویں خانہ میں ترجمہ سیپٹواجنٹ۔ اور چھٹے خانہ میں ترجمہ تھیودوشن کو درج کیا۔ اور جہاں سیپٹواجنٹ میں توضیح کے لئے کوئی لفظ دوسرے ترجموں سے لیکر بڑھایا گیا وہاں * ایسا نشان بنادیا گیا۔ اور جو لفظ اصل عبری میں نہ تھا وہاں + یہ نشان بنادیا گیا اور دو نشان ایسے ‡ + بھی اُس نے اپنی کتاب میں بعض بعض مقامات پر بنائے تھے مگر معلوم نہ ہوسکا کہ ان سے اُس کا کیا مقصد تھا؟ اس کتاب کے مرتب کرنے میں اُس کے (۲۸) سال صرف ہوے۔ بعد میں دو یونانی ترجمے اُسے اور دستیاب ہوگئے جنہیں شامل کرکے اُس نے اپنی کتاب کو آٹھ خانوں والی بناکر اس کا نام آکٹیپلا (Octapla) رکھدیا۔

اُس کے مولف اوریجن (Origen) کے متعلق اردو تواریخ کلیسا مطبوعہ ۱۸۷۰ء کے صفحہ ۷۶ پر درج ہے کہ:۔ "اوریجن کے باب میں اختلاف ہے۔ ایک فریق تو اُسے علم دین میں بڑا عالم تصور کرتا ہے۔ اور دوسرا فریق اُسے اریس اور دیگر بڑے بڑے ملحدوں اور بدعتیوں کی اصل ٹھیراکر لعنت دیتا ہے۔ بہت باتوں میں وہ پُر خطا عالم اور خطرناک ہادی ثابت ہوا"۔ یہ وہی اوریجن ہیں جن کی رائے کے بموجب مذہبی بحث میں عیسائیوں میں جھوٹی دلیلیں پیش کرنا ثواب ٹھیرایا گیا (دیکھو مِن تواریخ کلیسا صفحہ ۹۰) اور اسی ضمن میں وہ جعلی تصانیف بھی وجود میں آئیں جو بکثرت لکھی گئیں۔ یہ وہی اوریجن ہیں جن کے نام سے بت پرست بھی اپنی کتابیں مشہور کرتے تھے (دیکھو نارتھ انڈیا ٹریکٹ سوسائیٹی کی کتاب "طلوع آفتاب صداقت" مطبوعہ مرزاپور ۱۸۶۷ء صفحہ ۲۲۳)۔

اس تالیف میں اوریجن نے تین کام کئے۔ (۱) ترجمہ کیا۔ (۲) مختلف ترجموں کا مقابلہ کیا۔ (۳) تفسیر کی۔ یورپین مصنفین بکثرت اس جانب گئے ہیں کہ تفسیر میں اُس سے بہت غلطیاں ہوئیں اور وہ عبرانی زبان میں وقوف کامل نہ رکھتا تھا۔ مضامین توریت کی شرح اُس نے اپنی ہی عجیب الخیالی

کے مطابق کی ہے۔ اُس پر توہمات کا غلبہ تھا۔ اور اسی کے تحت میں وہ تفسیر کرتا تھا۔ بکثرت غلطیاں کھاتا تھا اور بقول ریورنڈ ہارن کے جہاں غلطی کھاتا تھا ایسی کھاتا تھا کہ کبھی کسی نے نہیں کھائی۔ ہارن صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اوریجن کی کتاب کی بار بار نقلیں ہوئیں۔ اور اس بے احتیاطی سے نقلیں ہوئیں کہ دو چار ہی برس میں جو امتیازی نشانات اوریجن نے اپنی اصلی تالیف میں لگائے تھے وہ جاتے رہے اور علامات اختلافات ترجمہ و تفسیر ترک کر دیئے گئے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اصل ترجمہ اور عبارات تفسیر میں امتیاز اٹھ گیا اور اصل و زوائد کی شناخت ناممکن ہوگئی۔ آیندہ کے لئے بھی کوئی امید نہ رہی کہ ان ترجموں میں حق کو باطل سے جدا کر دیا جائے کیونکہ یہ صورت اب محال ہوگئی ہے۔

قسطنطین رومی کے عہد میں جب دین عیسوی شاہی مذہب قرار پایا تو پاپائے روم دماسس نے سنہ ۳۸۳ء میں سینٹ جروم (S T. Jerome) کو توراۃ و انجیل کا رومی زبان میں ایک مستند ترجمہ مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا چنانچہ سنہ ۳۹۴ء میں اس نے اپنا رومی ترجمہ پیش کیا۔ ولگیٹ (Vulgate) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس بیچارے نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ ترجمہ صحیح اور قابل اعتماد ہو مگر وہ کیا کرتا اور کیا کر سکتا تھا۔ کتب مقدسہ کے اصلی اور صحیح نسخے مفقود تھے مروجہ نسخے غلطیوں سے پر تھے اور بقول ہارن صاحب کے اس زمانہ میں ناممکن ہو گیا تھا کہ صحیح اور الحاقی عبارات میں امتیاز ہو سکے۔ ابتداءً کلیساؤں نے اس ترجمہ کو معتبر نہ سمجھا مگر بعد میں کلیسائے روم نے اسے قبول کر لیا اور کونسل آف ٹرینٹ (Council of Trent) نے اسے "مستند" قرار دیدیا۔

تواریخ کلیسا مطبوعہ بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سنہ ۱۸۴۹ء کے صفحہ ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ: "جروم کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اُس نے کتاب مقدس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سنہ ۴۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک مغربی کلیساؤں میں کرسٹان خاص کر اسی ترجمہ سے کتاب مقدس کا مطلب سمجھتے تھے کیونکہ اُن ملکوں میں

لوگ یونانی اور عبرانی نہیں جانتے تھے"۔ کتاب سوال وجواب مترجمہ پادری یونس سنگھ اور پادری واٹس صاحب مطبوعہ الہ آباد مشن پریس ۱۸۶۴ء کے صفحہ ۳ پر سوال ۸ کے جواب میں لکھا ہے کہ :- " ایک بزرگ قسیس جروم نامی نے سنہ عیسوی چارسو کے قریب قریب یہ ترجمہ (یعنی لاطینی ترجمہ ولگیٹ) کیا۔ یہ ترجمہ بہت جلدی میں کیا گیا۔ اور بہت سی تبدیلیوں کے باعث سے بگڑ گیا"۔ پادری ٹامسن صاحب لکھتے ہیں کہ "اگرچہ جروم کے ترجمہ کی متعدد بار اور مختلف اوقات میں نظر ثانی ہوئی لیکن اس کا ترجمہ ناقص ہی ہے"

عہد عتیق کا ایک ترجمہ جرمنی زبان میں بھی ایک یہودی عالم جی تھل ابن اسحٰق بلیٹرا نے کیا جو ۱۶۷۹ء میں ایمسٹرڈیم میں طبع ہوا۔ مگر کارتھولٹ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کا ترجمہ کرنے والا خدا کو برا کہنے والا اور فریبی تھا جس نے مسیح کے متعلق چند پیشنگوئیوں کو چھپا دیا۔

علاوہ بریں شامی قبطی حبشی اور آرامی زبانوں میں بھی عہد عتیق کے ترجمے ہوئے مگر جو شہرت کہ مندرجہ بالا ترجموں کو حاصل ہوئی وہ ان کے حصہ میں نہ آئی۔

بائیبل کا آخری انگریزی ترجمہ جو آجکل مروج ہے بادشاہ جیمس کی بائیبل (King James Bible) کہلاتا ہے۔ یہ بادشاہ ۱۶۰۳ء میں انگلستان کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۶۰۴ء میں ہیمپٹن کورٹ کانفرنس (Hamptoncourt Conference) منعقد ہوئی جس میں ہر مذہبی گروہ اور فرقہ کے نمائندے شریک ہوئے اور خود بادشاہ صدر بنا۔ علاوہ مذہبی اختلافات کے دیگر مسائل کے جو اس کانفرنس میں پیش ہوئے۔ اس زمانہ کی مروجہ بائیبلوں پر بھی بکثرت شدید اعتراضات پیش کئے گئے۔ بادشاہ جیمس نے حکم دیا کہ ایک نیا ترجمہ تیار کیا جائے چنانچہ نیا ترجمہ تیار کیا گیا اور اسی بادشاہ کے نام سے منسوب ہوا۔ یہی انگریزی ترجمہ آجکل انگریزی بولنے والی اقوام میں رائج ہے۔ مگر کچھ عرصہ سے اس مشہور ترجمہ پر بھی نہایت شد و مد سے اعتراضات ہو رہے ہیں اور یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ اصل سے مطابق ہونے اور خوبی عبارت

میں یہ ترجمہ ناقص ہے اور مشکوک ہے اور غلط ہے یہانتک کہ بڑے بڑے اور اہم امور میں بھی یہ صحیح نہیں
اس ترجمہ کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر گدس اور جان بیلیی اور سر جیمس بلینڈ ہیں۔ انہوں نے اپنی طول طویل
تحریروں میں ترجمہ پر سخت اعتراضات کئے ہیں اس میں غلطیاں نکالی ہیں اور ایک نئے ترجمہ کی ضرورت
زور دیا ہے۔ جان بیلیی صاحب نے تو اپنی تحریر میں جسے انہوں نے ۱۸۱۸ء میں شایع کیا اس بات کا
صاف اقرار کیا ہے کہ ۱۶۱۱ء سے اصل عبرانی متن سے کوئی ترجمہ نہیں ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ چوتھی صدی
میں سینٹ جروم نے یونانی ترجمہ سے اپنا رومی ترجمہ کیا۔ اور ان کے رومی ترجمے سے ولگٹ مرتب ہوا اور رومی
ولگٹ سے یورپ کی تمام بقیہ زبانوں میں ترجمے ہوئے اس تقریر سے وہ بائبل کے ترجموں کی
غلطیوں کی ہمیشگی ثابت کرتے ہیں۔

ہر چند سال کے بعد پادریوں کی کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ اور جیمس
بائبل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے۔ چنانچہ اس بائبل پر نظر ثانی بھی ہوئی اور ریوائزڈ
ورشن (Revised version) عہد جدید کا ۱۸۸۱ء میں اور عہد قدیم کا ۱۸۸۵ء
میں طبع بھی ہوا مگر اصلی جیمس بائبل کے عام اقتدار میں ابھی تک کمی نہیں واقع ہوئی اور وہ لوگوں
کی نگاہ میں اپنی جگہ پر برقرار ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جہاں اصل ہی کا وجود مفقود ہو گیا ہو وہاں
ترجموں کی صحت کا اہتمام کیونکر ممکن ہے۔

مسلمانوں کیلئے سبق ان عبرتناک واقعات میں مسلمانوں کے لئے ایک سبق ہے۔ لوگوں کا اپنی
کتب سماوی کی اصلی زبان سے بے تعلق اور اجنبی رہنا اور محض ترجموں میں الجھے رہنا صحیح ہیئت کی
برقراری کے لئے مہلک ہے۔ جہانتک کتب سماوی کا تعلق ہے حفاظت مذہب دو چیزوں کی
متقاضی ہے تحفظ الفاظ اصلی و تحفظ معنی۔ مسلمانوں میں تحفظ الفاظ اصلی کی اہم خدمت قرآن کے
حافظوں کی جماعت انجام دے رہی ہے اور تحفظ معنی کی مفید تر خدمت کے لئے ہر ملک میں جہاں

مسلمان بستے ہوں اور ہر زمانہ میں قابل علمار کی ایک معتبر جماعت کی ضرورت ہے جو اس زبان میں بھی کامل دستگاہ رکھتے ہوں جس میں قرآن نازل ہوا اور اس زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے ہوں جو اس ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔

خدا ان مسلمان علمار کو اجر عظیم عطا فرمائے جنہوں نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ قرآن شریف کا ترجمہ لازمی طور پر عربی متن کے ساتھ شائع کیا جائے ۔کتب مقدسہ کے ترجموں کو متن سے معرّا کر کے چھاپنا نہایت مخدوش نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے ترجمہ کبھی اصل کی برابری نہیں کر سکتا بالخصوص کتب منزل من اللہ کا ایسا ترجمہ جس میں اصلی زبان کی خوبی پیدا ہو محال ہے ۔ اِنَّا اَنزَلنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا کی رو سے عربی کو قرآن کے ساتھ نہایت قوی اور مستقل تعلق ہے ۔ دراصل قرآن وہی ہے جو عربی زبان میں نازل ہوا۔ کسی اور زبان میں اس کے مطالب و معانی کا بیان قرآن نہیں بلکہ قرآن کا ترجمہ یا قرآن کی تفسیر ہے۔ نہایت متبرک اور قابل قدر ہیں وہ لوگ جو قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، قرآن کو حفظ کرتے ہیں، قرآن کے دور کرتے رہتے ہیں، قرآن کے تحفظ الفاظ میں کوشاں رہتے ہیں اور اس میں ایک زبر ایک زیر ایک شوشہ تک کا تغیر نہیں ہونے دیتے ۔ نہایت برکت والے ہیں وہ لوگ اگرچہ وہ یا ان میں سے بعض قرآن کے معنی پر عبور نہ رکھتے ہوں۔ معنے کے نہ سمجھنے سے وہ صرف اپنی ذات کو برکات معانی سے محروم رکھتے ہیں مگر امت محمدیہ کی ایک بہت بڑی خدمت ضرور انجام دیتے ہیں اور بقدر اس خدمت کے ثواب کے یقینی مستحق ہیں ۔ معانی کی اہمیت سے انکار نہیں بلکہ جن الفاظ پر ان معانی کا دار و مدار ہے ان کے تحفظ کی اہمیت سے یہاں بحث ہے ۔ مزید برآں ایک بات اور بھی ہے جس کے سُننے کا ہر شخص اہل نہیں ۔ کیونکہ پیام محبوب کی صورت ملفوظی میں از خود رفتگی پیدا کرنے والی جو خوش ادائیاں ہوتی ہیں ان سے افسوس ہے کہ وہ قلوب آشنا نہیں ہو سکتے جنہیں وَالَّذِینَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کی بزم الفت تک ابھی رسائی نہیں ۔ (باقی)

تفسیر سورۃ العصر

از جناب مولوی اکرم علیصاحب محمدی

وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۟

رب العزت ارشاد فرماتا ہے کہ "قسم ہے زمانہ کی۔ انسان بڑے نقصان میں ہے مگر وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق کی فہمایش کرتے رہے اور باہم صبر کی تلقین کرتے رہے"۔

والعصر میں واو قسمیہ ہے "عصر" کے معنی لغت میں۔ روزگار۔ زمانہ۔ اور نچوڑ کے ہیں جیسے عَصَرْتُ الثَّوْبَ - وَالْعِنَبَ - وغیرہما۔ میں نے کپڑا نچوڑا۔ انگور کو نچوڑا۔ (مصباح المنیر ۲ صفحہ ۱)

اصطلاح شرعی میں مطلق "عصر" بول کر مراد فرد کامل۔ یعنی خاص نماز عصر کا وقت لیتے ہیں کیونکہ وہ بھی دن کا نچوڑ ہوتا ہے۔ دنیا کے کاموں کا اخیر وقت جبکہ انسان اپنے کام کاج سے تھک کر سیر و تفریح کی جانب مائل ہوتا ہے۔ مزدور پیشہ اپنے کاموں کو جلد جلد ختم کرتے ہیں۔ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے ان کے آنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ "عصر سے مغرب تک کا وقت اللہ والوں کی عبادت کا خاص وقت ہے اسی لئے نماز عصر کی بہت تاکید ہے (حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی الخ) "صلوٰۃ وسطیٰ" سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اس کی تاکید میں (۶۹) حدیثیں موجود ہیں۔ اسی بنا پر بعض مفسرین نے سورۃ العصر میں العصر سے نماز عصر کی قسم مراد لی ہے۔ چنانچہ حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہ نے بھی اس سے مراد عصر کی نماز یا عصر کی نماز کا وقت لیا ہے مگر اس خادم نے عام معنی

ملحوظ رکھا۔ عصر کے معنی دہر، زمانہ کے ترجمہ میں اختیار کئے۔

اِنَّ۔ حرف مشبہ بالفعل تاکید کلام کے واسطے آتا ہے۔ اسم منصوب اور خبر مرفوع کو چاہتا ہے جیسے اِنَّ زَیْدًا قَائِمٌ انسان سے ہر ہر فرد انسان مراد ہے۔ خُسْرٍ کے معنے ٹوٹے۔ گھاٹے۔ اور نقصان کے ہیں۔

اِلَّا حرف استثناء ہے مراد یہ ہے کہ صاحب ایمان مصیبت میں صبر کرنے والے۔ اچھی باتوں کی ہدایت کرنے والے لوگ خُسران سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ یہاں بھی نقصان میں نہیں ہیں اور آخرت میں بھی نہیں رہیں گے۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد تین چیزیں اس کے کام آتی ہیں۔ ایک اعمال صالح۔ (نماز روزہ۔ حج۔ زکواۃ۔ خیرات۔ تلاوت قرآن وغیرہ) دوسرے صدقہ جاریہ (تعمیر مسجد۔ کنواں سرائے پُل وغیرہ) تیسرے اولاد صالح۔ کہ اگر لڑکا مدرسہ میں بسم اللہ بھی شروع کرے تو اُس کے والدین کو ثواب پہنچتا ہے۔

اس سورۂ شریف میں عمل صالح سے وہ امور مراد ہیں جو اللہ برتر نے ہم پر واجب فرمائے ہیں چنانچہ تفسیر القرآن میں ہے (اَیْ یُؤَدُّوْنَ مَا اَوْجَبَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ بِقَوْلِہٖ تَعَالٰی شَانُہٗ۔ یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا شَرُّہٗ مُسْتَطِیْرًا ۱۵ الجزء ۲۹ ع ۱۹) ترجمہ یعنی وہ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں۔ اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر چاروں طرف پھیل جانے والا ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ۔ اور جو حق بات ان تک پہنچتی ہے اس کو بسر و چشم تسلیم کرتے ہیں۔ (اَیْ بِقُبُوْلِ الْحَقِّ مِنْ اَیِّ جِھَۃٍ یَصِلُ اِلَیْھِمْ لِقَوْلِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ کَلِمَۃُ الْحِکْمَۃِ ضَالَّۃُ الْحَکِیْمِ حَیْثُ وَجَدَ فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ کی تفسیر ان الفاظ سے کی گئی ہے۔ عَلَی التَّکَالِیْفِ وَالْمَصَائِبِ لِمَا

اَنَّهُمْ مَامُوْرُوْنَ بِهٖ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی وَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ پارہ دوم رکوع سوم۔ یعنی جب ان کو کچھ مصیبت پہونچتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ہم اللہ ہی کا جان و مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ پس بہرحال راضی ہیں۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

شانِ نزول سورۂ والعصر شریف کی یہ ہے کہ کلدہ بن اَسَیدہ، جس کی کنیت ابوالاسد تھی زمانہ جاہلیت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ لیکن جب صدیق اکبر ایمان لے آئے تو یہ کافر ایک روز آپ سے ملکر کہنے لگا۔ کہ اے ابوبکر کیا تمہاری عقل پر پتھر پڑگئے۔ کہ اول تو تم نے تجارت میں بہتیرا مال و منال پیدا کیا اور اب بلکخت ایسے گھاٹے میں پڑگئے کہ زر و مال بھی لٹادیا۔ اور آبائی دین چھوڑکر لات وعزیٰ کی عبادت سے محروم، اور ان کی شفاعت سے مایوس بھی ہوگئے وغیرہ وغیرہ۔ اس کا جواب حضرت صدیق رضی اللہ عنہٗ نے یہ دیا کہ اے بے وقوف جو اللہ اور اس کا تابعدار بنتا، اور دینِ حق قبول کرتا ہے۔ وہ کبھی نقصان میں نہیں رہتا۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ نے اپنے حبیب کے صدیق عتیق کی صداقت باکرامت کو اپنے اس حُسنِ کلام سے مؤید فرمایا کہ سورۂ عصر نازل فرمائی۔

اِس المفسرین علامہ حافظ بہار الدین۔ اپنی تفسیر المعروف بہ ابن کثیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہٗ مسلمان ہونے سے قبل ایک مرتبہ مسیلمہ کذاب سے ملے جس نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر رکھا تھا۔ وہ بدبخت عمروؓ کو دیکھکر دریافت کرنے لگا کہ کہو اس مدت میں تمہارے یہاں کے نبی پر بھی کوئی وحی نازل ہوی ہے۔ حضرت عمرو نے جواب دیا کہ ہاں ایک مختصر سی مگر نہایت فصیح و بلیغ سورت نازل ہوئی ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ حضرت عمروؓ نے سورۂ والعصر شریف تلاوت فرمائی جس کو سنکر اول تو بہونچکا سا ہوگیا۔ مگر کچھ دیر سوچکر کہنے لگا کہ مجھپر بھی ایسی ہی ایک سورت اتری ہے۔

یَا وَبْرُیَا وَبْرُہ اِنَّمَا اَنْتَ اُذُنَانِ وَصَدْرُہ وَ سَائِرُکَ حَفْرٌ نَقْرٌ ہ عمرؓو سے کہا کہو اس وحی کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے آپ نے فرمایا کہ میرے خیال کو تو خود ہی جانتا ہے۔ کہ میں تیرے کذاب جھوٹا ہونے کا یقین رکھتا ہوں۔ وَبر۔ عربی میں اُس جانور کو کہتے ہیں جو بلی کے مشابہ ہوتا ہے مگر سینہ کشادہ اور دونوں کان ذرا بڑے ہوتے ہیں۔ باقی جسم وغیرہ بالکل حقیر ہوتا ہے (مُنجد۔ مؤلفہ لوئیس یسوعی اطبع مصر۔ اس کذاب بدلگام نے اپنے اس کلام نافرجام سے اللہ تعالیٰ کے کلام معجز نظام کا معارضہ کرنا چاہا۔ جسے سنکر عرب کے بُت پرست لوگوں نے بھی اس کو کاذب و مفتری سمجھ لیا۔

یہ ہے کلام رَبّانی کی حقانیت اور رسول اُمی صلعم کا معجزہ۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ اِس سورت کو غور و تدبر سے پڑھیں اور سمجھیں تو صرف یہی ایک سورۃ والعصر کافی وافی ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ کلام ربانی کی ہر آیتہ لاثانی ہے لیکن ہمارے ہی فہم کا قصور ہے کہ ہم اُس کی طرف دل سے متوجہ نہیں ہوتے۔ کاش کہ ہم جیسے دُنیوی امور میں منہمک اور اپنے معاملات کے گرویدہ ہیں۔ اسلامی احکام کے بھی ایسے ہی دل دادہ اور دِوالہ و شیدا ہوجائیں۔ کہ فلاح دارین پائیں

حدیث اور قرآن

منکرین حدیث کے مسلک پر ایک ناقدانہ نظر

ہمارے پاس رسالہ "بلاغ" امرتسر کے دفتر سے ایک رسالہ بغرض تبصرہ آیا ہے جس کا عنوان ہے "منکر حدیث کیوں ہوا"۔ مصنف کوئی صاحب ہیں جنہوں نے اپنے لئے "حق گو" کا لقب اختیار فرمایا ہے۔ انہی "حق گو" صاحب کا ایک مفصل مضمون "مطالعہ حدیث" کے عنوان سے "نگار" اور "بلاغ" کے صفحات میں باقساط شائع ہوتا رہا ہے جس کے بعض حصے ہماری نظر سے گذرے ہیں۔ دلائل قریب قریب وہی ہیں جو عموماً منکرین حدیث کی جانب سے پیش کئے جاتے ہیں، اور ان سب کا مآل یہ ہے کہ ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہے، حدیث کی روایات ناقابل اعتبار ہیں، اور ان پر مذہب کی بنیاد رکھنا صحیح نہیں ہے۔ حق گو صاحب اور ان کے ہم خیال منکرین حدیث کی رائے میں حدیث نے اسلام کو قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچایا، بلکہ اس کے برعکس اسی چیز نے دشمنان اسلام کو وہ اسلحہ فراہم کئے ہیں جن سے وہ اسلام پر حملے کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی خواہش ہے کہ اسلام سے حدیث کو بالکل خارج کر دیا جائے اور اس کو وہ اسلام کی ایک بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

حق گو صاحب نے اپنی تائید میں حدیث کی کتابوں سے بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ احادیث سے کس طرح دشمنوں کو اسلام اور رسول اکرمؐ کی رسالت پر حملہ کرنے کے لئے سواد حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً بعض احادیث تحریف قرآن کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ بعض اس الزام کی تائید کرتی ہیں کہ وحی کا نزول ایک ڈھونگ تھا، رسول اللہؐ جو کچھ اہل کتاب سے

سنتے تھے اسی کو وحی بنا کر پیش کر دیتے تھے (معاذ اللہ) بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی کا نزول رسول اللہ کی خواہشات نفسانی کے مطابق ہوتا تھا، بعض اس امر کی شہادت دیتی ہیں کہ رسول اللہ مسحور کئے جاتے تھے، بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ اپنے مخالفین کو خفیہ طریقوں سے قتل کرا دیتے تھے (کعب بن اشرف کا واقعہ)، بعض سے رسول اللہ پر ظلم اور بے رحمی کا الزام عائد ہوتا ہے، (عکل اور عرینہ والوں کا قتل)، بعض سے رسول اللہ پر نفس پرستی کا الزام نکلتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مصنف نے رسول اکرم پر شادا ایکٹ بھی نافذ کیا ہے اور ان سب روایات کو ناقابل تسلیم ٹھیرا دیا ہے جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ سے نو سال کی عمر میں شادی ہونا ثابت کرتی ہیں۔ اس کے بعد مصنف علم حدیث پر عام اعتراضات کرتا ہے۔ اس کے خیال میں حدیث کی اشاعت عہد خلفاے راشدین میں ممنوع تھی بنوامیہ اور آل عباس کے زمانے میں روایت کا سلسلہ شروع ہوا، اور بادشاہوں کی سیاسی اغراض کے لئے حدیثیں وضع کی گئیں۔ امام حسن بصری امام زہری، امام مالک، صحاح ستہ کے مصنفین اور دوسرے وہ لوگ جنہوں نے حدیث کی کتابیں مدون کی ہیں سب کے سب مصنف کے زعم میں وضاع حدیث تھے، اور ان لوگوں نے بے سروپا روایتیں جمع کرکے اسلام کو مسخ کر دیا۔ سیاسی اغراض کے علاوہ حدیث میں یہودیت مسیحیت مجوسیت اور دوسرے مذاہب کے عقائد اور خرافات بھی داخل ہوگئے، پانچ وقت کی نمازیں، تین دن کے روزے، صراط اور میزان کا تخیل، احکام ذبیحہ، کھانے پینے کی چیزوں میں مذہب کا دخل، ختنہ، قربانی، احکام طہارت، تصاویر و تماثیل کی حرمت، معراج کے قصے اور ایسی ہی بہت سی چیزیں مصنف کے نزدیک محدثین نے دوسرے مذاہب سے لیں اور رسول اللہ کی طرف منسوب کرکے اسلام میں داخل کر دیں۔

ائمہ فقہ بھی مصنف کے نزدیک قابل طعن ہیں، کیونکہ انہوں نے شریعت کا تخیل یہودیوں سے لے کے اسلام کے سر تھیک دیا، زندگی کے تمام معاملات پر مذہب کو حاوی کر دیا، جو قوانین عراق کی آب و ہوا اور پہلی دوسری صدی کے حالات کی بنا پر وضع کئے گئے تھے، رسول اللہ کی طرف منسوب کرکے

مذہبی قوانین بنادیے گئے اور اس طرح مذہب اسلام "قومی شریعت" کا پابند ہوکر اس قابل نہ رہا کہ دنیا میں اس کی اشاعت ہوتی، اور دوسری قومیں اس کا اتباع کر سکتیں، مصنف کے نزدیک سینٹ پال اور اس کے متبعین کا یہ خیال درست تھا کہ مذہب (یعنی ایمانیات) کو شریعت سے الگ کر دیا جائے، اور یہی چیز دنیا میں مسیحیت کی اشاعت کا سبب ہوئی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی مصنف کے خیال میں اس لئے ہوئی کہ شریعت کی بیڑیوں کو کاٹ دیں، اور زندگی کے معاملات کو مذہب کی پابندیوں سے آزاد کر دیں دلیل میں یہ آیت پیش کی گئی ہے کہ یَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ اس آیت میں اغلال سے مراد مصنف کے نزدیک "اغلال شریعت" ہیں مگر ائمۂ فقہ اور ائمۂ حدیث نے رسول اللہ کے خلاف بغاوت کر کے پھر انہی اغلال شریعت کو مسلمانوں پر ڈال دیا جنہیں کاٹنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کئے گئے تھے، اور یہود کی تقلید میں روایت حدیث، اور "شریعت سازی" شروع کر دی۔ یہ سب کچھ مصنف کی رائے میں اس لئے کیا گیا کہ یہود کے فریسیوں کی طرح مسلمانوں پر اپنی گرفت قائم کی جائے اور اس کے لئے رسول اللہ کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھایا گیا۔

پھر لطف یہ ہے کہ مصنف اپنے ان تمام نظریات کی بنا تاریخی استدلال پر رکھتا ہے، حالانکہ اگر حدیث کی روایات قابل اعتبار نہیں ہیں، تو تاریخ ان سے بھی زیادہ ناقابل اعتبار ہے۔ حدیث میں تو ہمارے زمانہ سے لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام یا ائمہ تک اسناد کا پورا سلسلہ موجود ہے خواہ وہ آپ کے نزدیک مشکوک ہی کیوں نہ ہو لیکن تاریخ کے پاس تو کوئی سند ہی نہیں ہے۔ جن قدیم کتابوں کو آپ تاریخ کا سب سے زیادہ معتبر ذخیرہ سمجھتے ہیں ان کے متعلق آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں ہے کہ جن مصنفین کی طرف وہ منسوب ہیں وہ انہیں کی لکھی ہوئی ہیں اسی طرح جو حالات ان کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں ان کے لئے بھی آپ کوئی ایسی سند نہیں رکھتے جس کی بنا پر ان کی صحت کا یقین کیا جاسکے

اگر حدیث کی مسلسل اور مستند روایات کی تکذیب اس آسانی کے ساتھ کی جا سکتی ہے تو تاریخ کے پورے ذخیرے کو اس سے بھی زیادہ آسانی کے ساتھ رد کر دیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص بے تکلف کہہ سکتا ہے کہ عباسیوں کا وجود دنیا میں کہیں نہ تھا، اموی کسی سلطنت کے بانی نہ تھے سکندر کا وجود محض ایک افسانہ ہے غرض تاریخ کے ہر واقعہ کو اس دلیل سے بدرجہا زیادہ قوی دلیل کی بنا پر جھٹلایا جا سکتا ہے جن کی بنا پر آپ حدیث کو جھٹلاتے ہیں، کیونکہ دنیا میں زمانۂ گذشتہ کے حالات کا کوئی ذخیرہ اتنا مستند نہیں ہے، جتنا حدیث کا ذخیرہ ہے۔ اور جب وہ بھی ناقابل اعتبار ہے، تو قدیم زمانہ کے متعلق جتنی روایات ہم تک پہنچی ہیں وہ سب دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ تعجب ہے کہ جو شخص حدیث کی روایات سے انکار کرتا ہو، اور جس کے نزدیک یہ ممکن ہو کہ رسول اللہ سے قریب تر زمانہ میں، ایسے ایسے نامور مسلمان جن سے زیادہ نمایاں ہستیاں مسلمانوں کی قوم سے پیش نہیں کی جا سکتیں، اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود رسول اللہ پر بہتان گھڑ سکتے تھے، اور اپنے دل سے حدیثیں وضع کر کے رسول اللہ کی طرف منسوب کر سکتے تھے، وہ تاریخ پر کیسے اعتماد کرتا ہے، اور کیوں نہیں کہتا کہ طبری، ابن اثیر، ابن خلدون اور تاریخ کی تمام کتابیں موضوع ہیں، افسانہ ہیں، اور گذشتہ زمانہ کا کوئی حال ہم تک صحت کے ساتھ نہیں پہنچا ہے۔ اس سے زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ جو شخص بخاری و مسلم، ترمذی اور ابوداؤد حتیٰ کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام حسن بصری تک کو ناقابل اعتماد سمجھتا ہے وہ فون کریمر سے استناد کرنے میں تامل نہیں کرتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بات کی پچ آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔

حق گو صاحب کا رسالہ اگر کوئی ناواقف مسلمان یا غیر مسلم پڑھے تو اس کے دل پر یہ بات نقش ہو جائے گی کہ رسول اللہ کی وفات پر پچاس برس بھی نہ گذرے تھے کہ مسلمانوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف عام بغاوت کر دی اور وہی لوگ اس بغاوت کے سرغنے بنے جو اسلام کی مذہبی تاریخ میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اور جنہیں مذہب اسلام کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ ان لوگوں کے

دل میں ایمان کا شائبہ تک نہ تھا کہ انہوں نے اپنی اغراض کے لئے حدیث، فقہ، سنت، اور شریعت کے شاندار الفاظ گھڑے، اور دنیا کو دہوکہ دینے کے لئے وہ باتیں رسول اللہ کی طرف منسوب کیں جو آنحضرت اور قرآن کی تعلیم کے بالکل خلاف ہیں۔ یہ اثر پڑنے کے بعد ہمیں امید نہیں کہ کوئی شخص اسلام کی صداقت کا قائل ہوگا۔ کیونکہ جس مذہب کے ائمہ اور ممتاز ترین داعیوں کا حال یہ ہو اس کے پیرؤوں میں صرف حق گو صاحب اور ان کے ہم خیال گنتی کے چند آدمیوں کو دیکھ کر کون عقلمند یہ باور کرے گا کہ ایسا مذہب بھی کوئی سچا مذہب ہو سکتا ہے یہی نہیں بلکہ اس قسم کے اعتراضات کو دیکھ کر ایک شخص اس امر میں بھی شک کر سکتا ہے کہ آیا اسلام اپنی اصلی شکل میں اس وقت موجود ہے بھی یا نہیں۔ کیونکہ جب مسلمانوں کے اسلاف میں پہلی صدی سے لیکر اب تک کوئی گروہ بھی ایسا موجود نہیں رہا ہے جو اپنے پیغمبر کے حالات، اقوال اور تعلیمات کو ٹھیک ٹھیک محفوظ رکھتا، اور جب اس قوم کے چھوٹے بڑے سب کے سب ایسے بددیانت تھے کہ جو کچھ جی میں آتا تھا گھڑ کر اپنے رسول کی طرف منسوب کر دیتے تھے، تو اسلام کی کسی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا یہ بھی یقین نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں فی الواقع کوئی پیغمبر مبعوث ہوا تھا کیا عجب کہ عوام پر گرفت قائم کرنے کے لئے رسول اور رسالت کا افسانہ گھڑ لیا گیا ہو۔ اسی طرح قرآن کے متعلق بھی شک کیا جا سکتا ہے کہ یہ فی الواقع کسی پیغمبر پر اترا تھا یا نہیں اور اگر اترا بھی تھا تو اپنی اصل عبارت میں محفوظ ہے یا نہیں، کیونکہ اس کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ وہی لوگ تو ہیں جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کی باتیں بے کر پیغمبر کی طرف منسوب کرتے ہوئے ذرا نہ شرماتے تھے، یا وہ لوگ ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا تھا اور وہ دم نہ مارتے تھے۔ "حق گو" صاحب اور ان کے ہم خیال منکرین حدیث نے یہ ایسا حربہ دشمنان اسلام کے ہاتھ میں دیدیا ہے، جو حدیث کے فراہم کئے ہوئے حربوں سے لاکھ درجہ زیادہ خطرناک ہے۔ اس سے تو اسلام کی جڑ بنیاد ہی کھود کر پھینک دی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ "حق گو" صاحب نے حدیث کی کتابوں پر صرف عیب چینی کی نگاہ ڈالی ہے اور ان کے بے شمار جواہر کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف ان چیزوں کو تلاش کیا ہے، جو ان کے نزدیک حدیث پر طعن کرنے کے لئے مفید ہو سکتی تھیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسی عیب چینی کی نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے تو یہ کتاب بھی ان کو سراسر عیوب سے لبریز نظر آتی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ہزارہا کفار قرآن کو پڑھتے ہیں، اور بجائے ہدایت پانے کے اور زیادہ گمراہ ہو جاتے ہیں؟ یہی نا کہ وہ ہدایت کی طلب میں قرآن نہیں پڑھتے بلکہ عیوب تلاش کرنے اور اسلام کے خلاف اسلحہ فراہم کرنے کے لئے پڑھتے ہیں۔ اسی وجہ سے تو ان کو قرآن میں بجز عیوب کے اور کچھ نہیں ملتا، کیونکہ انسان ہر جگہ وہی پاتا ہے جس کی اسے طلب ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت "حق گو" صاحب کی آنکھوں پر عیب چینی کی عینک نہ لگ گئی، ورنہ وہ دیکھتے کہ مخالفین اسلام کو بہت سے اسلحہ اس کتاب نے بھی فراہم کئے ہیں، اور یہ بات ان کو قرآن سے بھی انکار کر دینے پر اسی طرح آمادہ کر دیتی جس طرح حدیث کے فراہم کردہ اسلحہ دشمنوں کے ہاتھ میں دیکھ کر انہوں نے حدیث سے انکار کر دیا۔

"حق گو" صاحب نے حدیث پر جتنے اعتراضات کئے ہیں، ان سب کا لفظ بہ لفظ جواب دیا جا سکتا ہے، لیکن ہم جزئیات میں الجھنا مناسب نہیں سمجھتے، بلکہ چند اصولی باتوں پر کلام کرنا چاہتے ہیں جو دراصل مدار بحث ہیں۔ اگرچہ ان کی اور عام منکرین حدیث کی عیب جویانہ ذہنیت کو دیکھتے ہوئے اصلاح کی امید کم ہے، لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ ان لوگوں کی گمراہی کا آغاز دراصل نیک نیتی کے نقطہ سے ہوتا ہے، اور محض ناواقفیت اور ضد ان کو غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے اس لئے ہم امید کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنے ذہن کو منکرانہ خیالات سے تھوڑی دیر کے لئے خالی رکھ کر ہمارے دلائل پر غور کیا تو ان کے عقیدہ کی اصلاح ہو جائے گی۔

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطہ سے کیوں نازل کیا؟ کیا اللہ اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اتار دیتا اور انکا ایک ایک نسخہ نوع بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا؟ اگر وہ اس پر قادر نہ تھا تو عاجز تھا۔ اس کو خدا ہی کیوں مانیے۔ اور اگر وہ قادر تھا اور یقیناً قادر تھا تو اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ یہ تو ظاہر ہے ہدایت کا ایک یقینی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ایسے صریح معجزے اور بین خرق عادت کو دیکھ کر ہر شخص مان لیتا کہ یہ ہدایت خدا کی طرف سے آئی ہے لیکن خدا نے ایسا نہ کیا اور ہمیشہ رسولوں ہی کے ذریعہ سے کتابیں بھیجتا رہا۔ پھر اس رسالت کے کام پر بھی اس نے فرشتوں یا دوسری غیر انسانی ہستیوں کو مامور نہ کیا، بلکہ ہمیشہ انسانوں ہی کو اس کے لئے منتخب فرمایا ہر زمانہ کے کفار نے بہتیرا کہا کہ اگر خدا کو ہم تک کوئی پیغام پہنچانا منظور ہی ہے تو وہ فرشتے کیوں نہیں بھیجتا تاکہ ہم کو بھی اس پیغام کے منزل من اللہ ہونے کا یقین آجائے۔ مگر خدا نے ہر ایسے سوال پر یہی فرمایا کہ اگر ہم فرشتے بھی بھیجتے تو ان کو آدمی بنا کر بھیجتے وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا۔ (۶:۹) اور یہ کہ اگر زمین میں فرشتے بستے ہوتے تو ہم ان کی ہدایت کے لئے فرشتے بھیجتے۔ لَوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔ (۱۷:۹۵)

سوال یہ ہے کہ تنزیل کتب کے لئے رسولوں کو واسطہ بنانے اور رسالت کے لئے تمام بندگان خدا میں سے بالخصوص انسانوں ہی کو منتخب کرنے پر اس قدر اصرار کیوں ہے؟ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں، وہ الٰہی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ انہی کے نمونے کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں۔ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۴: ۶۴)۔ انبیاء علیہم السلام پے در پے آئے اور ہر ایک نے لوگوں سے یہی

مطالبہ کیا کہ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ (۲۶: ۶-۷-۸-۹-۱۰)
نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا کہ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (۳: ۴) مومنوں
سے کہا گیا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳: ۳) اگر محض کتاب اللہ اتاری
جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے اور کوئی اس کا فیصلہ کرنے والا
نہ ہوتا۔ لوگ احکام کے منشاء سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشاء بتانے والا نہ ہوتا۔ اس ضرورت
کو تو خیر ایک حد تک فرشتے بھی پورا کر سکتے تھے مگر پاکیزگی، طہارت اور تقوی کے احکام پر لوگ یہ خیال
کرتے کہ عملی زندگی میں ان پر عمل کرنا انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ فرشتہ تو انسانی جذبات سے محروم
ہے پیٹ نہیں رکھتا۔ شہوانی قوتیں نہیں رکھتا انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہے، اس کے لئے تقیات نہ
زندگی بسر کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مگر ہم انسانی کمزوریاں رکھتے ہوئے اس کی تقلید کیسے کریں؟ اس کے لئے
ضروری تھا کہ ایک انسان، انہی جذبات و داعیات اور انہی تمام قوتوں اور انسانی تقیدات
کے ساتھ زمین پر آتا اور لوگوں کے سامنے احکام آلہی کے مطابق زندگی بسر کر کے بتاتا کہ اس طرح انسان
خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر سکتا ہے۔ اس کو زندگی کے وہ تمام معاملات پیش آتے جو انسان کو پیش آتے ہیں
وہ ان تمام معاملات میں عام انسانوں کے ساتھ شریک ہوتا۔ عملاً حصہ لیتا، اور قدم قدم پر ان کو اپنے
عمل اور اپنے قول سے ہدایات دیتا، ان کی تربیت کرتا، اور انہیں بتاتا کہ زندگی کی پیچیدہ راہوں
میں سے کس طرح انسان بچ کر حق اور نیکی کے سیدھے راستہ پر چل سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود اللہ تعالی
نے ہمارے لئے تنہا کتاب اللہ کو کافی نہ سمجھا اور رسول اللہ کے اتباع اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی
کو اس کے ساتھ لازم کر دیا۔

قرآن شریف میں صاف طور پر تین چیزوں کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک حکم خدا۔
دوسرے حکم رسول۔ تیسرے اولی الامر من المومنین کا حکم۔ اطیعوا اللّٰہ و اطیعوا الرَّسُوْلَ وَ

اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (۴ : ۸) اگر محض قرآن کا اتباع کافی ہوتا اور اس کے سوا کسی دوسری چیز کے اتباع کی حاجت نہ ہوتی تو رسول اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہی نہ دیا جاتا۔ اگر رسول اور اولی الامر کا حکم، قرآنی احکام پر زاید کوئی شئے نہ ہوتا، تب بھی بقیہ دونوں کی اطاعت کا حکم الگ دینا بے معنی تھا۔ تین چیزوں کی اطاعت کا الگ الگ حکم دینا صاف بتاتا ہے کہ قرآن میں جو احکام براہ راست اللہ تعالیٰ نے دئے ہیں، ان کے علاوہ، وہ احکام بھی واجب الاطاعت ہیں جو رسول اللہ دیں، اور ان کی اطاعت بعینہ ایسی ہے جیسے اللہ کی اطاعت۔ مَن یطع الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (۴ : ۱۱) پھر ان کے ماسوا جو احکام مسلمانوں کے اولوالامر دیں ان کی اطاعت بھی لازم ہے بشرطیکہ ان کے احکام خدا اور رسول کے احکام سے اصولی مطابقت رکھتے ہوں۔ اختلاف کی صورت میں ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی دی ہوئی ہدایات کی طرف رجوع کیا جائے۔ فَاِنْ تَنَازَعتم فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ۔ (۴ : ۸)

اس سے معلوم ہوا کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے، اور احکام رسول کی اطاعت اور اسوۂ رسول کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول و اسوۂ رسول کو نہ لیں گے وہ رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہے، وہ اس واسطہ کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطہ کے طور پر قائم فرمایا ہے، وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کی ہدایت کے لئے کافی تھی مگر خدا نے بلاضرورت یہ فعل عبث کیا کہ کتاب کو رسول کے ذریعہ سے نازل فرمایا، سبحانہ و تعالیٰ عما یقولون

کتاب اللہ اور سنت رسول کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجئے کہ آیا رسول اللہ کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی، صرف ان کی حیات جسمانی

تک ضروری تھی؟ ان کے بعد اس کی حاجت باقی نہیں رہی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لئے تھی جس میں آپ جسم کے ساتھ زندہ تھے۔ آپ کے رحلت فرماتے ہی آپ کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہوگیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب محض بے معنی ہوجاتا ہے۔ رسول کا کام اگر محض ایک نامہ بر کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کی ضرورت نہ تھی تو ہم پھر وہی کہینگے کہ اس صورت میں رسول کی ضرورت ہی نہ تھی، یہ کام کوئی فرشتہ کرسکتا تھا، بلکہ اسے بلا واسطہ بھی کرنا ممکن تھا۔ لیکن اگر کتاب پہنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شئے کی ضرورت تھی اور اسی کے لئے اطاعت اور اتباع کے احکام دیے گئے تھے، اور اگر ہدایت نوع بشری کے لئے قرآن کے ساتھ رسول کی ہدایات اور سیرت نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر یہ سب کچھ صرف تیئیس چوبیس سال کے لئے ہونا کیا معنی؟ محض ایک صدی کے چوتھائی حصہ کے لئے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدت کے لئے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا، اور ایک ایسی چیز کو اتنی شد و مد کے ساتھ ذریعۂ ہدایت قرار دینا جو رسول کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لئے غیر ضروری ہوجانے والی تھی، بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ جو خدائے حکیم و دانا کے ہرگز شایان شان نہیں ہے۔

اس الزام کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دفع کردیا ہے۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۲۱: ۷) ظاہر ہے کہ اگر رسول اللہ کا فیضان رسالت صرف اپنے زمانے تک کے لئے ہوتا تو آپ کو رحمۃ للعالمین نہیں کہا جاسکتا تھا؟ اگر کہا جائے کہ آپ قرآن لائے ہیں جو ہمیشہ رہنے والا ہے اور اسی لئے آپ رحمۃ للعالمین ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ بذات خود رحمت نہ ہوئے بلکہ قرآن کے واسطے سے ہوئے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو الگ رحمت فرمایا ہے اور اس کے لانے والے کو الگ۔ پھر یہ جو فرمایا ہے کہ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ

إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَّنَذِيرًا وَّلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۳۴ : ۳) یہ ارشاد صاف اشارہ کر رہا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت سے لیکر قیامت تک جن بندگان خدا پر لفظ "الناس" کا اطلاق ہوتا ہے۔ ان سب کے لئے آپ خدا کے رسول ہیں۔ آپ کی رسالت کسی خاص زمانہ کے لئے نہیں ہے، بلکہ جب تک روئے زمین پر "الناس" بستے ہیں اس وقت تک آپ کی رسالت قائم ہے۔ آیتہ میں کوئی قرینہ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ "الناس" سے صرف اسی زمانہ کے لوگ مراد ہیں۔ نہ ایسا کوئی خفیف سے خفیف اشارہ موجود ہے جس سے بعد کے کسی خاص زمانے تک کی قید نکلتی ہو۔ بخلاف اس کے دوسری آیات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں کہ حضور کی رسالت دائمی ہے۔ اللہ تعالی حضور کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر چکا ہے۔ اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (۵ : ۱) حضور کی ذات پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا (۳۳ : ۵) اور دوسرے انبیا کی لائی ہوئی کتابوں کے بخلاف آپ کی لائی ہوئی کتاب کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کیا گیا ہے کیونکہ پہلی کتابیں مخصوص زمانوں کے لئے ہدایت تھیں اور یہ دائمی ہدایت ہے۔ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ۔ (۱۵ : ۱)۔

باقی

نقد و نظر

مرآۃ المثنوی | مرتبہ جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے رکن دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

ضخامت تقریباً ۱۲۰۰ سو صفحہ۔ قیمت عـہ سکہ انگریزی۔ لـہ سکہ حالی۔

اسلامی ادبیات میں مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کو جو مرتبہ حاصل ہوا وہ غالباً کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے کہ مولانا صرف صاحب قال نہ تھے بلکہ صاحب دل اور صاحب حال بھی تھے وہ اپنی گہری بصیرت اور زبردست روحانی قوت سے اسلام کی اصل روح تک پہنچ گئے اور کلام اللہ و سنت رسول سے براہ راست اکتساب معرفت کرکے انہوں نے فارسی زبان میں جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی قدرت عطا فرمائی تھی، حقایق اسلام کو ایسے انداز میں پیش کیا جو اپنی نظیر آپ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی شریف کی اشاعت کے بعد سے بکثرت اہل علم اور ارباب معرفت نے شروح اور حواشی لکھ کر اس کی خدمت کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ قاضی تلمذ حسین صاحب نے اس مبارک کتاب کے لئے جو کام کیا ہے، وہ آج تک کسی نے نہیں کیا۔ انہوں نے تقریباً ۲۲ سال مثنوی شریف کے مطالعہ میں صرف کئے ہیں، اور بڑی عرق ریزی کے بعد تین کتابیں مرتب کی ہیں۔ مرآۃ المثنوی، نقد المثنوی، اور صاحب المثنوی۔ ان تینوں میں سے پہلی کتاب طبع ہو چکی ہے، اور اسوقت ہمارے زیر نظر ہے۔

اس کتاب میں فاضل مرتب نے مثنوی کو چار عنوانات پر تقسیم کیا ہے اور ان موتیوں کو جو مثنوی کے صفحات میں بکھرے ہوئے تھے الگ الگ چن کر چار خوبصورت ہار تیار کر دیے ہیں۔ پہلا عنوان احسن القصص کا ہے جس میں تمام حکایات ترتیب وار جمع کر دی گئی ہیں۔ دوسرا عنوان مدد و حکم

کا ہے جس میں جگہ جگہ سے حقائق و معارف کو چن کر یکجا مرتب کر دیا گیا ہے۔ تیسرا عنوان جواہر القرآن کا ہے مولانا نے جن جن آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح فرمائی ہے، ان سب کو اس عنوان کے تحت سلسلہ وار نقل کر کے ان کے نیچے مولانا کی تفسیر درج کر دی گئی ہے۔ آخر میں لآلی کامن ہیں۔ اس میں جواہر القرآن کی طرح احادیث نبوی کو نقل کر کے ان کے نیچے مولانا کی شرح لکھی گئی ہے۔ کتاب کے آغاز میں مضامین کے اعتبار سے دو مکمل فہرستیں دی گئی ہیں، آخر میں درر الحکم کے دو انڈکس بنائے گئے ہیں۔ اگر کسی شخص کو مثنوی شریف کا کوئی خاص مضمون یاد ہو، یا کسی شعر کے صرف ایک دو الفاظ یاد رہ گئے ہوں، تو وہ ان انڈکسوں کی مدد سے بآسانی وہ مقام نکال سکتا ہے جو اسے مطلوب ہے۔ اس کے ساتھ ایک فرہنگ بھی ہے جس میں مثنوی شریف کے خاص خاص الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔

قاضی صاحب کی محنت حقیقت میں بہت قابل قدر ہے۔ مولانا کے جانشین حضرت برہان الدین ولد چلپی، پروفیسر نکلسن، مولانا عبد الباری، فرنگی محلی علیہ الرحمہ اور دوسرے اکابر اہل علم نے اس کی دل کھول کر داد دی ہے۔ جو لوگ مثنوی شریف سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں ان کیلئے اس کتاب کا مطالعہ اگزیر ہے

رسالہ بلاغ | اڈیٹر جناب شہباز کاشمیری ایم اے و جناب اصغر بی اے قیمت تین روپیہ سالانہ۔

پتہ :۔ دفتر بلاغ امرتسر۔

یہ ماہوار رسالہ کئی سال سے جاری ہے مقصد تعلیمات قرآنی کی اشاعت ہے۔ عام مضامین کم ہوتے ہیں۔ بڑا حصہ تفسیر بیان للناس کا ہوتا ہے جو تقریباً سال بھر سے باقساط شائع ہو رہی ہے۔ تعلیم قرآن کا مقصد ایک بہترین مقصد ہے مگر اس کے ساتھ انکار حدیث کا مسلک ایسا ہے جس سے ہم اتفاق نہیں کر سکتے۔

قواعد و نرخنامہ اشتہارات

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـــہ	صیـــہ	صلعـــہ	لـــہ
نصف صفحہ	ســے	صیـــہ	صیـــہ	للعـــہ
ربع صفحہ	للعہ	ســـہ	ہوـــہ	صعـــہ

۱ - کوئی خلاف شریعت یا خلاف تہذیب اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳ - صرف وہی چربے قبول کئے جائیں گے جو اس رسالہ کی وضع و ہئیت کا لحاظ رکھ کر تیار کئے گئے ہوں۔

۴ - نرخنامہ میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جائے گی۔

۵ - ٹائٹل کے صفحات کی اجرت عام نرخنامہ کی بہ نسبت ۲۵ فی صدی زیادہ ہوگی۔

Registered No. M. 2950

رجسٹر نمبر آصفیہ (۱۲۰)

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۵ تاریخ کو شائع ہوا کریگا۔ مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہنچے وہ دوبارہ لکھکر منگوا سکتے ہیں۔ ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی انکو پرچہ قیمتاً دیا جائیگا۔

رسالہ کی موجودہ قیمت میں کسی قسم کی رعایت ممکن نہیں ہے۔ لہذا کوئی صاحب رعایت کا مطالبہ نہ کریں۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کیلئے مضامین اور حل طلب شکوک تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں۔ لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر "ترجمان القرآن"

خیریت آباد۔ حیدر آباد (دکن)

طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد